فصل اوّل

فقہ حنفی اور اس کے اصولِ اجتہاد

فقہ حنفی کے بانی

دوسری صدی ہجری کے ربع اوّل میں تدوین فقہ اسلامی کی ابتداء ہوئی۔ اس کام کا آغاز امام ابوحنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) نے کیا۔ ان کے فوراً بعد امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ) نے بھی قرآن وسنت کی روشنی میں قوانین اسلام کو مرتب کیا۔ ان دونوں حضرات کے کچھ عرصے بعد امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) اور بعض دوسرے فقہاء نے بھی انہی خطوط پر کام کیا۔ اہل سنت میں چار اماموں کی فقہ رائج ہوگئی اور ان کے مستقل مسالکِ فقہ اور مکاتب فکر قائم ہوگئے۔ اہل سنت کے باقی ائمہ کی فقہ اور ان کے مسالک مسلمانوں میں رائج نہ ہوسکے اور بتدریج متروک ہوگئے۔

اس مسلک کے بانی امام ابوحنیفہؒ ہیں۔ ان کا نام نعمان بن ثابت ہے۔ آپ ۸۰ ہجری میں کوفہ میں پیدا ہوئے[1]۔ کوفہ اس وقت عراق میں فقہاء کا مرکز تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو معلّم اور قاضی بنا کر وہاں بھیجا تھا۔

تمام ثقہ مورخین کہتے ہیں کہ امام صاحب کے والد صغرسنی میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت امیر المؤمنین نے ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں دعائے خیر کی۔ امام صاحب کے دادا زوطیٰ کبھی کبھی حضرت امیر المؤمنین کے دربار میں حاضر ہوتے اور خلوص عقیدت کے آداب بجالاتے۔

زوطیٰ کی نسبت وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ خاص کس شہر کے رہنے والے تھے۔ مؤرخین

۱۔ تاریخ بغداد ۳۲۴/۱۳

Marfat.com

نے مختلف شہروں کے نام لکھے ہیں، لیکن قرائن اور دلائل کے بغیر کسی ایک شہر کو ترجیح دینا مشکل ہے۔ البتہ یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ ان کا تعلق سرزمین فارس سے تھا اور وہ فارسی النسل تھے (۲)۔

اس وقت ان علاقوں میں بہت سے خاندان اور قبیلے اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔ غالباً، زوطیٰ اس زمانے میں اسلام لائے اور جوش وشوق میں عرب کا رخ کیا۔ حضرت علیؓ کا دورِ خلافت تھا اور شہر کوفہ کو دارالخلافہ ہونے کا شرف حاصل تھا، اسی شرف اور خصوصیت نے زوطیٰ کو کوفہ میں طرحِ اقامت ڈالنے پر مجبور کیا۔

ابوحنیفہ کنیت رکھنے کی وجہ

تذکرہ نگاروں نے ابوحنیفہ کنیت رکھنے کی مختلف وجوہ بیان کی ہیں۔ کسی نے کہا کہ حنیفہ عراقی زبان میں دوات کو کہتے ہیں، چونکہ آپ کو قلم دوات سے گہرا لگاؤ تھا اس لیے ابوحنیفہ کنیت اختیار کی۔ لیکن یہ محض قیاس اور اٹکل کے تیر ہیں، حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ ان توجیہات کی راہ اس لیے کھلی کہ آپ کے کوئی بیٹی نہ تھی۔ صاحب الخیرات الحسان نے تصریح کی ہے کہ حماد کے سوا آپ کے کسی بیٹے یا بیٹی کا علم نہیں (۲)۔

امام ابوحنیفہؒ تابعی ہیں

امت محمدیہ میں سب سے بزرگ اور اعلیٰ مرتبہ صحابہؓ کا ہے جنہیں بارگاہِ خداوندی سے دائمی خوشنودی کا پروانہ مل چکا ہے۔ صحابہؓ کے بعد تابعین، اسلام میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ فرمانِ نبوی ہے: خیر الناس قرنی، ثم الذین یلونهم، ثم الذین یلونهم، یعنی بہترین لوگ میرے زمانے کے لوگ ہیں، اس کے بعد جو ان سے متصل ہیں اور پھر جو ان سے متصل ہیں۔ محی الدین نوویؒ (م ۶۷۶ھ) اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دور صحابہؓ کا زمانہ ہے، دوسرا دور تابعین کا اور تیسرا تبع تابعین کا (۳)۔

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ۱/۳۹

۲۔ الخیرات الحسان ص ۱۲

۳۔ شرح صحیح مسلم ۲/۳۰۹، ۳۱۰

Marfat.com

امام صاحب ۸۰ ہجری بمطابق ۶۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت تیس صحابہؓ بقید حیات تھے۔ اس حقیقت کا اعتراف سبھی نے کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے صحابہؓ کا زمانہ پایا ہے، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ)، علامہ ابن جوزیؒ (م ھ)، علامہ خطیب بغدادیؒ (م ۴۶۳ھ)، علامہ ابن خلکانؒ (م ۶۸۱ھ) اور علامہ ابن حجر مکیؒ جیسے ائمہ فن نے تسلیم کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ جناب رسالت مآب کے خادمِ خاص حضرت انس بن مالکؓ کی زیارت سے کئی بار مشرف ہوئے ہیں[1]۔

حضرت انسؓ کی آمد و رفت کے علاوہ خود کوفہ میں امام صاحب کی پیدائش کے وقت نو صحابہؓ موجود تھے۔ علامہ ابن ندیمؒ (م ۳۸۰ھ) اور علامہ ابن سعدؒ (م ۲۳۰ھ) نے آپ کو تابعین کے طبقہ پنجم میں شمار کیا ہے۔ اگر اختلاف ہے تو صرف اس بات میں کہ امام صاحب نے کسی صحابی سے روایت کی یا نہیں۔ بہر کیف تابعی ہونے کا شرف آپ کی قسمت میں تھا اور وہ آپ کو حاصل ہوا۔

علمی زندگی کا آغاز

حنفی مسلک کی ابتداء کوفہ سے ہوئی۔ امام ابوحنیفہؒ نے اپنی علمیتِ زندگی کا آغاز علم کلام سے کیا۔ کوفہ کے ممتاز فقیہ امام حماد بن ابی سلیمانؒ (م ۱۲۰ھ) سے فقہ پڑھی۔ عملی زندگی کے لحاظ سے آپ ریشمی کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے۔ علمِ کلام میں مہارت اور پیشہ تجارت نے آپ میں عقل اور رائے سے مدد لینے، عملی اور کاروباری مشاہدات و تجربات سے فائدہ اٹھانے، شرعی احکام کو عملی زندگی میں جاری کرنے اور جدید مسائل میں قیاس و استحسان سے کام لینے کی بہترین صلاحیت پیدا کر دی تھی۔

انتخابِ حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کی احتیاط

علمی تبحر کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ نے اپنے اقران میں ممتاز مقام پایا اور امام اعظم کہلائے۔ آپ انتخاب حدیث میں بہت محتاط تھے، صرف وہی حدیث لیتے تھے جو ثقہ ذریعہ سے ثابت ہو۔ اسی بناء پر بعض ناقدین نے یہاں تک کہا کہ امام ابوحنیفہؒ سے صرف سترہ حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے جس کی سرے سے کوئی اصل نہیں ہے۔

۱۔ البدایۃ والنہایۃ ۱۰/۱۰۷

Marfat.com

محدثین نے حدیث کے حوالہ سے امام ابوحنیفہؒ کی ایک تالیف مسند ابی حنیفہ کا ذکر کیا ہے جو احادیث وآثار کا مجموعہ ہے اور فقہی ترتیب پر مدون کیا گیا ہے۔ علماء نے اس کے بارے میں یہ بات کہی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اپنی مسند کو چالیس ہزار احادیث وآثار سے منتخب کیا ہے۔

بعض علماء نے اس کے بارے میں کہا کہ یہ کتاب امام ابوحنیفہؒ کی تالیف نہیں بلکہ ان کے تلامذہ نے فقہی مسائل کی طرح ان سے اخذ کر کے احادیث وآثار کو جمع کر دیا اور مہذب ومرتب کر کے فقہی ترتیب کے ساتھ کتابی شکل دے دی۔ انہی روایات کا اکثر حصہ جمع کر کے امام ابو یوسفؒ (م۱۸۲ھ) نے اس کا نام الآثار رکھ دیا، نیز امام محمدؒ (م۱۸۹ھ) کی کتاب الآثار بھی اس نوع کی ہے کیونکہ ان دونوں کتابوں کی مرویات عام طور پر ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں (۱)۔

اگر یہ بات مان لی جائے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اس مجموعہ کو خود مرتب نہیں کیا، تب بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ بات تو سبھی مانتے ہیں کہ ان کے شاگردوں نے احادیث وآثار کو انہی سے اخذ کر کے کتابی صورت میں جمع کیا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ان کے پاس احادیث وآثار کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ ان کے تلامذہ نے اس سے اخذ وانتخاب کر کے ایک مجموعہ مرتب کر لیا۔ اس سے منطقی طور پر اس بات کی نفی ہوگئی کہ امام ابوحنیفہؒ سے صرف سترہ حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ نے تو فقہی مسائل اور اپنے اجتہادات بھی خود کتابی شکل میں جمع نہیں کیے، وہ بھی ان کے لائق تلامذہ نے جمع کیے اور انہیں مرتب ومدون کیا۔ کیا اس بنیاد پر امام ابوحنیفہؒ کے فقیہ ومجتہد ہونے کا انکار ممکن ہے کہ انہوں نے مسائل فقہ یا اپنی آراء اور اجتہادات پر مشتمل کوئی کتاب تالیف نہیں کی؟ اگر فقہ میں کسی کتاب کے مرتب نہ ہونے کے سبب امام ابوحنیفہؒ کے فقیہ ومجتہد ہونے کا انکار ممکن نہیں ہے تو پھر حدیث میں کسی مجموعے کے مرتب مدوّن نہ ہونے کی وجہ سے ان کے محدّث ہونے کا انکار بھی مبنی برحقیقت نہیں ہوسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کے رفقاء اور تلامذہ نے احادیث کے ایسے پندرہ مجموعے مرتب کیے جن میں جمع کردہ احادیث انہیں امام ابوحنیفہؒ سے پہنچی ہیں۔ ان مجموعوں کو قاضی القضاۃ محمد بن محمود

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ۱/۱۵۹

Marfat.com

خوارزمی (م ۶۵۵ھ) نے ایک جلد میں جامع المسانید کے نام سے جمع کیا ہے۔ بڑے بڑے محدثین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو جیسے علم کلام اور علم فقہ میں منفرد اور ممتاز مقام حاصل تھا، اسی طرح حدیث میں بھی ان کا درجہ اپنے اقران سے کم نہ تھا(۱)۔

امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) کے استاد مکی بن ابراہیمؒ (م ۲۱۵ھ) نے امام ابوحنیفہؒ سے استفادہ کیا اور ان کے بارے میں یہ الفاظ کہے ''میں نے ابوحنیفہ کی خدمت میں رہ کر ان سے حدیث اور فقہ کا علم حاصل کیا اور بہت سی احادیث ان سے روایت کیں''(۲)۔

صحاح ستہ کے مرکزی راوی مسعر بن کدامؒ (م ۱۵۵ھ) علم حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کی برتری کو بڑی فراخدلی سے تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں ''میں نے ابوحنیفہؒ کے ساتھ علم حدیث حاصل کیا لیکن وہ ہم پر غالب رہے۔ ہم نے ان کے ساتھ تحصیلِ فقہ کیا، اس میں انہوں نے جو کمال حاصل کیا اور مہارت پیدا کی وہ تم لوگوں سے مخفی نہیں''(۳)۔

یہ بات امام ابوحنیفہؒ کے عہد اور مزاج کے عین مطابق تھی کہ تصنیف و تالیفِ کتب میں وقت صرف نہ کیا جائے۔ تالیفِ کتب کا دور امام صاحب کی زندگی کے آخری ایام میں یا ان کی وفات کے بعد شروع ہوا۔ صحابہؓ میں مجتہدین نے اپنے فتاویٰ اور اقوال و آراء کی تدوین پر توجہ نہیں کی بلکہ سنتِ نبوی تک کی تدوین سے گریز کرتے تھے۔ اس کا اصولی اور بنیادی سبب یہ تھا کہ اصولِ دین میں کتاب اللہ کے سوا کوئی دوسری کتاب مدوّن نہ ہونے پائے کیونکہ قرآن ہی عمودِ شریعت، نورِ مبین اور حبلِ متین ہے۔ لیکن پہلی صدی گزر جانے کے بعد حالات نے مجبور کیا کہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کتابی صورت میں محفوظ و مدوّن کی جائے۔ چنانچہ فقہائے مدینہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ اور تابعین کے اقوال و فتاویٰ مدوّن کرنے شروع کیے اور پورے غور و فکر کے بعد انہی کو وہاں کے فقہاء نے اپنے اجتہاد و قیاس کی بنیاد بنایا۔

۱۔ کردی، مناقب امام اعظم ۱/۲۰۳
۲۔ موفق، مناقب امام اعظم ۱/۲۰۳
۳۔ البدایۃ والنہایۃ ۱۰/۱۰۷

Marfat.com

اہل عراق نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت علیؓ اور قاضی شریحؒ (م ۷۸ھ) کے فتاویٰ اور فیصلوں کو بنیاد بنایا۔ امام ابراہیم نخعیؒ (م ۹۵ھ) نے ان حضرات کے فتاویٰ اور ان کے مبادیات کو ایک مجموعے کی شکل میں مرتب کیا تھا۔ اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کے شیخ امام حمادؒ (م ۱۲۰ھ) کے پاس بھی اسی قسم کا مجموعہ تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مجموعوں کی حیثیت باقاعدہ کتب کی نہیں تھی بلکہ ان کی نوعیت یادداشتوں کی سی تھی۔ انہیں افادۂ عام کی غرض سے وسیع تر صورت میں متعارف نہیں کرایا گیا۔ البتہ فقہاء، مجتہدین اور عام اہل علم حسب ضرورت ان مرتبہ یادداشتوں سے استفادہ کرتے تھے۔ اس قسم کی یادداشتوں کا ثبوت صحابہؓ کے ہاں بھی ملتا ہے۔ تابعین کے دور میں یہ رواج پڑ گیا اور پہلی صدی گزر جانے کے بعد جب تدوین علوم کا دور شروع ہوا تو انہی مجموعوں کو سامنے رکھا گیا اور انہی کے طرز پر تالیف کتب کی ابتداء ہوئی (۱)۔

امام ابوحنیفہؒ نے فقہ میں کوئی کتاب تالیف نہیں کی

امام صاحب نے فقہ میں براہ راست کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن آپ کے تلامذہ نے آپ کے افکار، اقوال اور آراء کو پوری توجہ اور محنت کے ساتھ محفوظ و مرتب کیا۔ کبھی کبھی امام صاحب خود بھی املا کرا دیا کرتے تھے۔ امام محمد بن حسن شیبانیؒ (م ۱۸۹ھ) نے ان کی جملہ آراء اور فتاویٰ کو مدوّن کیا۔ اگرچہ وہ کلیۃً انہوں نے امام صاحب سے اخذ نہیں کیے کیونکہ امام صاحب کے ساتھ ان کا زمانہ مصاحبت بہت مختصر ہے۔ البتہ انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کے اقوال و آراء پر مشتمل دوسرے مجموعوں سے مدد لی اور بطور خاص امام ابوحنیفہؒ کے افکار و آراء اور اجتہادات کے ان تک پہنچنے کا سب سے بڑا ذریعہ امام ابو یوسفؒ (م ۱۸۲ھ) بنے (۲)۔

بعض روایات اس بات کی بھی نشان دہی کرتی ہیں کہ امام صاحب کے تلامذہ ان کے فتاویٰ، اجتہادات اور اقوال و آراء جمع کرتے رہتے تھے اور بعض اوقات خود امام صاحب ان مدوّنات پر نظر ثانی کرا دیتے تھے تاکہ ترمیم و اصلاح ہو سکے۔ مختلف روایات اور شواہد سے اس بات

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ۱/۲۰۳

۲۔ حوالہ بالا ۱/۱۵۸

Marfat.com

کی تائید ہوتی ہے کہ جن لوگوں نے امام صاحب کی طرف کتابوں کو منسوب کیا ہے یا یہ کہا ہے کہ انہوں نے فقہ کو مرتب کیا، ان کا مطلب بھی یہی ہے کہ امام صاحب کے اقوال و آراء کو ان کے تلامذہ نے مرتب کیا۔

موفق بن احمد مکیؒ (م ۵۶۸ھ) نے دعویٰ کیا ہے کہ علم شریعت کے سب سے پہلے مدوّن امام ابوحنیفہؒ ہیں، اس کارِ خیر میں کسی نے ان پر سبقت حاصل نہیں کی (۱)۔

امام ابوحنیفہؒ نے بنوامیہ کا آخری دور اور بنوعباس کا ابتدائی دور پایا۔ دونوں حکومتوں نے آپ کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا عہدہ پیش کیا لیکن آپ نے منظور نہ کیا- انہوں نے جس عظیم کام کا بیڑا اٹھایا تھا، اس کی تکمیل میں حکومت کے عہدے قبول کرنا رکاوٹ بن سکتا تھا۔ آپ نے جس کام کی ابتداء کی تھی اس میں آزادی فکر، آزادی رائے اور خودداری بنیادی حیثیت کی حامل تھی اور آپ اسے مجروح کرنا نہیں چاہتے تھے۔

قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول نہ کرنے کی پاداش میں آپ کو قید کی سزا دی گئی اور جیل ہی میں رجب ۱۵۰ ہجری میں آپ نے وفات پائی (۲)۔

امام ابوحنیفہؒ کے اصولِ اجتہاد

حقیقت یہ ہے کہ احکام کا استنباط اور ان کی تفریع تابعین بلکہ صحابہؓ کے زمانے ہی میں شروع ہو چکی تھی لیکن استنباط اور استخراج کا جو طریقہ تھا، اس کو کوئی خاص علمی شکل نہیں دی گئی تھی۔ جس طرح لوگ کسی عبارت سے کسی نتیجہ کا استنباط یا کسی حکم کی تفریع محض وجدان اور ذوق کی بنیاد پر کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کا استنباط یا تفریع کس قاعدہ کلیہ کے تحت ہے اور اس کے کیا قیود و شرائط ہیں، فقہی مسائل کے احکام بھی اسی طرح مستنبط کیے جاتے تھے، نہ علمی اصطلاحات وضع ہوئی تھیں اور نہ اصول وضوابط منضبط ہوئے تھے۔

بنوامیہ کے آخری دور میں علمی اصطلاحات کا ظہور ہوا۔ چنانچہ واصل بن عطاء نے احکام

۱۔ موفق، مناقب امام اعظم ۱/۹۵

۲۔ امام ابو حنیفة، حیاته و عصره (اُردو ایڈیشن) ص ۹۵

Marfat.com

شرعیہ کی تقسیم کی اور کہا کہ ثبوتِ حق کے چار طریقے ہیں: ۱- قرآن ناطق، ۲- حدیث متفق علیہ، ۳- اجماع امت اور ۴- عقل و حجت یعنی قیاس۔ واصل نے اور بھی چند اصطلاحات وضع کیں مثلاً یہ کہ عموم وخصوص دو جداگانہ مفہوم ہیں، نسخ صرف اوامر ونواہی میں ہوسکتا ہے اور اخبار و واقعات میں نسخ کا احتمال نہیں۔ ان مسائل کے لحاظ سے اصولِ فقہ میں اوّلیت کا فخر واصل کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ اسی قسم کی اوّلیت ہوگی جیسے علم نحو کے دو تین قاعدوں کے بیان کرنے سے یہ کہا جانے لگا کہ علم نحو کے موجد حضرت علیؓ ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کے زمانے تک جو کچھ ہوا تھا وہ اس سے زیادہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ نے فقہ کو مجتہدانہ اور مستقل فن کی حیثیت سے ترتیب دینا چاہا۔ اس لیے استنباط اور استخراجِ احکام کے اصول اور قواعد وضوابط وضع کرنے پڑے۔

امام ابوحنیفہؒ کی علمی زندگی میں جو چیز سب سے عظیم اور قابل قدر ہے وہ اصول استنباط کا انضباط ہے جن کے سبب فقہ جواب تک جزئیاتِ مسائل کا نام تھا، ایک مستقل فن بن گیا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ قواعد جن کو اصولِ فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، سب سے پہلے امام شافعیؒ نے وضع کیے۔ یہ بات اس لحاظ سے تو صحیح ہے کہ امام شافعیؒ سے پہلے یہ مسائل مربوط طریقے سے احاطۂ تحریر میں نہیں آئے تھے لیکن اصل فن کی بنیاد امام شافعیؒ سے بہت پہلے پڑ چکی تھی اور اگر تحریر کی قید اٹھادی جائے تو امام ابوحنیفہؒ اس کے موجد کہے جاسکتے ہیں۔

فقہی اصول وقواعد کو امام ابوحنیفہؒ نے وضع اور مربوط ومنظم کیا۔ یہ بات کسی دلیل و برہان کی محتاج نہیں کیونکہ امام ابوحنیفہؒ نے جزوی اور فروعی مسائل کے احکام معلوم کرنے کے لیے عقلی اور اجتہادی اَدِلّہ سے اس وقت کام لیا جب اکثر ائمۂ مجتہدین پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ نے جزوی اور فروعی مسائل کے احکام معلوم کرنے کے لیے عقلی اور اجتہادی اَدِلّہ کو اس حد تک وسعت دی کہ ان کے بعد آنے والے بھی ان کے نقش پا پر نہ چل سکے۔

امام ابوحنیفہؒ کے اصول اجتہاد کیا تھے؟ اس کی وضاحت خود انہوں نے بایں طور کی:

''میں سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اگر وہاں مسئلہ کا کوئی حکم نہیں ملتا تو پھر سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رخ کرتا ہوں، اگر ان دونوں مصادر میں بھی حکم نہ ملے تو پھر اقوالِ صحابہؓ تلاش کرتا ہوں۔ جس صحابیؓ کا جو قول حسبِ موقع ہوتا ہے اسے لے لیتا ہوں، نہیں ہوتا تو چھوڑ دیتا ہوں۔ اقوالِ صحابہؓ کے دائرے سے باہر قدم نہیں نکالتا۔ لیکن جب معاملہ صحابہؓ سے نکل کر ابراہیمؒ، شعبیؒ، ابن سیرینؒ، عطاءؒ، اور سعید بن مسیبؒ تک پہنچ جاتا ہے تو پھر بات یہ ہے کہ یہ لوگ بھی اجتہاد کرتے تھے اور میں بھی ان کی طرح اجتہاد کرتا ہوں''(۱)۔

مناقب امام اعظم میں موفق مکیؒ (م ۵۶۸ھ) لکھتے ہیں:

''امام ابوحنیفہؒ کتاب اللہ کے بعد متفق علیہ حدیث کو تلاش کرتے۔ حدیث نہ ملتی تو قیاس سے کام لیتے۔ اس کے بعد استحسان کو کام میں لاتے۔ حلِ مسائل کے لیے جمہور مسلمین کے عرف اور تعامل سے مدد لینے میں بھی تامل نہیں کرتے تھے۔ قیاس اور استحسان میں سے جو مصلحتِ عامہ کے لیے زیادہ مفید ہوتا اسے اختیار کرتے۔ لوگوں کے معاملات و مسائل پر ان کی گہری نظر تھی، وہ ہمیشہ ان کی سہولت اور فلاح کے جویا رہتے اور امکانی حد تک قباحت اور دشواری سے گریزاں رہتے''۔

موفق مکیؒ ہی کا کہنا ہے:

''امام ابوحنیفہؒ حدیث کے ناسخ و منسوخ میں انتہائی تفحص سے کام لیتے تھے۔ جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جاتی اس پر عمل کرتے۔ اہل کوفہ کی حدیثوں کو ان سے بڑھ کر پہچاننے والا کوئی نہ تھا۔ وہ سختی کے ساتھ

۱۔ تاریخ بغداد ۳۶۸/۱۳

Marfat.com

حدیث کا اتباع کرنے والے تھے''(۱)۔

ابن عبدالبرؒ (م۱۸۲ھ) نے بھی اپنی کتاب **الانتقاء** میں امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں ایسا ہی کچھ نقل کیا ہے۔

ان تینوں وضاحتوں سے امام صاحب کے علم اور طرزِ استدلال کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان تین روایتوں کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات ہیں جو امام صاحب کے مصادرِ فقہ کی نشان دہی کرتی ہیں لیکن بنیادی طور پر ان میں کوئی فرق اور تناقض نہیں ہے۔

تاریخ بغداد اور **الانتقاء** سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دلیل اوّل کتاب اللہ تھی، دلیل ثانی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دلیل ثالث اجماع صحابہؓ اور اختلافِ صحابہؓ کی صورت میں ان کے دائرہ اقوال میں رہتے ہوئے کسی ایک قول سے تمسک، جو ان کے نزدیک کتاب وسنت سے استنباط میں مطابقت رکھتا ہو اور قیاس سے مربوط ہو۔

دوسری تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی نص نہ ملتا تو قولِ صحابیؓ اختیار کرتے، وہ بھی نہ ملتا تو قیاس سے کام لیتے، پھر استحسان سے اور اس کے بعد لوگوں کے عرف وعادت کو بنیاد بناتے۔

ان تصریحات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے شہر میں جو فقہی تعامل رائج ہوتا اس کو بھی حل مسائل میں دلیل اور مأخذ کے طور پر استعمال کرتے۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلا کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جو فقہی دلائل اور مصادر قابل قبول اور قابل عمل تھے، وہ سات تھے:

۱-کتاب اللہ	۲-سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
۳-اقوالِ صحابہؓ	۴-اجماع
۵-قیاس	۶-استحسان اور
۷-عرف وعادت	

قرآن اور سنت متواترہ سے ثابت حکم قطعی اور سنت غیر متواترہ، جیسے خبر آحاد سے ثابت

۱۔ موفق، مناقب امام اعظم ۸۲/۱

Marfat.com

حکم ظنّی ہوتا ہے۔ قرآن اور سنتِ متواترہ سے ثابت احکام فرض، اور سنتِ غیر متواترہ سے ثابت اوامر میں سے بعض احکام واجب، بعض سنت مؤکدہ اور بعض مستحب ہوتے ہیں۔ جن احکام کی ممانعت دلیل قطعی سے ثابت ہو وہ حرام اور جن احکام کی حرمت دلیل ظنّی سے ثابت ہو ان میں سے بعض مکروہ تحریمی (جس میں حرمت کا پہلو زیادہ ہو) اور بعض مکروہ تنزیہی (جائز مگر ناپسندیدہ) ہیں۔ ثبوت اور استدلال کے لحاظ سے سنتِ غیر متواترہ کا درجہ قرآن اور سنتِ متواترہ کے بعد ہوتا ہے، اس لیے استدلال احکام میں اس مسلمہ فرق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

کیا امام ابوحنیفہؒ سنت پر قیاس کو ترجیح دیتے تھے؟

فقہاء کے درمیان یہ بحث بڑی معرکہ خیز رہی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اجتہاد و استنباط میں سنت پر کس حد تک اعتماد کرتے تھے۔ بعض فقہاء نے ان کے بارے میں یہ بات کہی کہ وہ قیاس کو سنت پر مقدم رکھتے تھے۔

اس ضمن میں سب سے پہلی اور اصولی بات تو یہ ہے کہ خود امام ابوحنیفہؒ نے اپنے جو اصولِ اجتہاد بیان کیے ہیں اور جن کا اجمالی ذکر تاریخ بغداد اور الانتقاء کے حوالے سے ابتدائی سطور میں ہو چکا ہے، امام ابوحنیفہؒ نے واضح طور پر یہ بات کہی ہے کہ میں سب سے پہلے مسئلہ کا حکم کتاب اللہ میں دیکھتا ہوں، اگر اس میں نہ ملے تو پھر سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ امام جعفر صادقؒ کو بھی یہی غلط فہمی تھی جسے امام ابوحنیفہؒ نے ان سے ملاقات کی وقت انتہائی عقلی اور مدلّل انداز سے رفع کیا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس الزام یا غلط فہمی کی عام اور واضح انداز میں تردید کی اور فرمایا:

> ''اللہ کی قسم! وہ لوگ دروغ گو اور افتراء پرواز ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم سنت پر قیاس کو مقدم سمجھتے ہیں۔ جب نص موجود ہو، خواہ وہ قرآن سے ہو یا سنت سے تو پھر قیاس کی کیا ضرورت اور گنجائش باقی رہ جاتی ہے''(۱)۔

۱۔ المیزان الکبریٰ ص ۵۱

اس سلسلے میں امام ابوحنیفہؒ کی یہ وضاحت بھی موجود ہے:

''ہم اس وقت تک قیاس سے کام نہیں لیتے جب تک شدید ضرورت لاحق نہ ہو جائے۔ زیرِ غور مسئلے میں سب پہلے کتاب وسنت سے رجوع کرتے ہیں پھر صحابہؓ کے اقوال، فتاویٰ اور فیصلے دیکھتے ہیں۔ جب وہاں بھی کوئی حکم نہیں ملتا تو پھر قیاس سے کام لیتے ہیں''(۱)۔

امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ سنت پر قیاس کو ترجیح دیتے تھے، غلط فہمی کا نتیجہ ہے کیونکہ فقہاء میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے احادیثِ آحاد کو حجت مانا ہے۔ اگر وہ کسی مرحلے پر قیاس کر لیتے اور بعد میں انہیں رائے کے خلاف کوئی حدیث مل جاتی، خواہ وہ خبرِ واحد ہی کیوں نہ ہو، تو وہ اپنی رائے کو حدیث کے مطابق کر لیتے تھے۔

قاضی ابو یوسفؒ (م۱۸۲ھ) اور امام محمد بن حسن شیبانیؒ (م۱۸۹ھ) کی کتاب الآثار کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کس طرح بے جھجک احادیثِ آحاد کو قبول کرتے تھے، اپنی فقہ کے لیے انہیں کو بناء قرار دیتے، ان کے متن سے استدلال کرتے اور پھر اسی سے عللِ احکام کا استخراج کرتے تھے۔ فقہ امام ابوحنیفہؒ میں سنت پر قیاس کو ترجیح دینے کی مثال تو کیا ملتی وہ تو صحابی کے قول، فتوے یا فیصلے پر بھی اپنی رائے کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔ آئندہ سطور میں اس کی وضاحت آ رہی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ سنت کی حجیت کے اس حد تک قائل تھے کہ حدیث صحیح کے ذریعے کتاب اللہ کے کسی حکم میں اضافے کو جائز سمجھتے تھے، جیسے رجم کی سزا۔ قرآن حکیم میں حدِ زنا سو کوڑے بیان کی گئی اور اس میں یہ تخصیص اور تجزیہ نہیں تھا کہ شادی شدہ اور کنوارے کی ایک ہی سزا ہوگی یا جدا۔ بلکہ قرآن کے اجمال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواہ کوئی کنوارا ہو یا شادی شدہ، سب کی سزا رجم ہوگی۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس حدیث کی رو سے قرآنی حکم پر اضافہ کیا کہ جرم زنا کا ارتکاب کرنے والے اگر شادی شدہ ہوں گے تو ان کی سزا رجم ہوگی۔ دوسرے تمام فقہاء کا بھی یہی مسلک ہے۔

۱۔ المیزان الکبریٰ ص ۵۱

Marfat.com

حضرت ابو ہریرہؓ کی اس حدیث کی بناء پر امام ابوحنیفہؒ نے قیاس کو ترک کیا کہ روزہ دار اگر بھول کر کچھ کھالے یا پی لے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور کہا کہ اگر یہ حدیث نہ ملتی تو میں قیاس سے کام لیتا[1]۔

ابن امیر الحاجؒ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ دوسرے فقہاء کی طرح خبر واحد کو قیاس پر مقدم رکھتے تھے قطع نظر اس سے کہ اس حدیث کا راوی فقیہ ہے یا غیر فقیہ، جیسا کہ ابھی ذکر کیا کہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی وجہ سے قیاس کو چھوڑ دیا حالانکہ حضرت ابو ہریرہؓ کا شمار غیر فقیہ صحابہ میں ہوتا ہے[2]۔

امام ابوحنیفہؒ نے کفارہ یمین کے روزوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کی بناء پر تتابع (پے در پے روزے رکھنے) کی شرط لگائی۔ اس طرح کی کئی مثالیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے حدیث متواتر یا حدیث مشہور کی بناء پر قرآنی احکام ونصوص پر اضافہ کیا ہے۔

اقوالِ صحابہؓ کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا طرزِ عمل

صحابہ کرامؓ کے اقوال، فتاویٰ اور فیصلوں کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ موقف بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ سنت کے بعد صحابہؓ کے اقوال اور فتاوی کو حجت مانتے ہیں اور صحابہؓ کے ہاں انہیں کوئی حکم مل جاتا تو قیاس سے گریز کرتے تھے۔ یہ صورتِ حال تو اس وقت تھی کہ کسی مسئلہ اور واقعہ کے بارے میں کسی ایک صحابی کا قول، فتویٰ یا فیصلہ ملے، لیکن ایک ہی مسئلہ کے بارے میں مختلف صحابہؓ کے اقوال مل جائیں اور ان میں باہم اختلاف ہو تو پھر کیا کیا جائے؟ اس بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا طریق کار انتہائی عقلی اور متوازن تھا۔ خلیفہ ابو جعفر منصورؒ (م ۱۵۸ھ) نے امام صاحب کو لکھا کہ میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ آپ قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں امام صاحب نے لکھا:

> ''وہ بات صحیح نہیں ہے جو امیر المومنین کو پہنچی ہے۔ میں سب سے پہلے کتاب اللہ سے رجوع کرتا ہوں، وہاں مسئلہ کا حکم نہیں ملتا تو سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

۱۔ موفق، مناقب امام اعظم ۹۵/۱

۲۔ حوالہ بالا

Marfat.com

میں تلاش کرتا ہوں، وہاں بھی ناکامی ہوتی ہے تو خلفائے راشدینؓ کے فیصلے اور ان کی آراء دیکھتا ہوں۔ اس کے بعد باقی صحابہؓ کے اقوال، فتاویٰ اور قضایا کو۔ صحابہؓ اگر کسی معاملے میں مختلف ہوں تو پھر بے شک میں قیاس سے کام لیتا ہوں''(۱)۔

امام ابوحنیفہؒ سے ایک روایت یہ ہے:

''جو حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو وہ سر آنکھوں پر، کسی صورت میں ہم سے اس کے خلاف سرزد نہیں ہوسکتا۔ رہے صحابہ کرامؓ کے اقوال اور قضایا، تو ان میں سے ہم بہتر کا انتخاب کریں گے۔ اس کے بعد معاملہ ہے تابعین اور تبع تابعین کے اقوال وفتاویٰ کا، تو بات یہ ہے کہ وہ بھی آدمی تھے اور ہم بھی آدمی ہیں''(۲)۔

امام ابوحنیفہؒ قرآن، سنت اور اقوالِ صحابہؓ کے فرقِ مراتب کو اس حد تک ملحوظ رکھتے ہیں کہ اگر انہیں ایک مسئلہ کے بارے میں دو مختلف اقوال ملیں، ان میں ایک قول خلفائے راشدینؓ میں سے کسی ایک کا اور دوسرا کسی عام صحابی کا تو وہ خلیفہ راشد کے قول کو اختیار کرتے ہیں اور عام صحابی کے قول کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر دو مختلف اقوال خلفائے راشدینؓ میں سے ہوں تو پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے قول کو پہلے، حضرت عمر فاروقؓ کے قول کو دوسرے، حضرت عثمان غنیؓ کے قول کو تیسرے اور حضرت علیؓ کے قول کو چوتھے نمبر پر رکھتے ہیں۔ یہ نہیں کرتے کہ حضرت علیؓ کے قول کو حضرت عثمانؓ کے قول پر اور حضرت عمرؓ کے قول کو حضرت ابوبکرؓ کے قول پر ترجیح دے لیں۔

استدلال اور استخراجِ احکام کے ضمن میں اس سے بہتر اور متوازن طریق کار کوئی نہیں ہوسکتا۔

امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد حسن بن زیاد لؤلؤیؒ (م ۲۱۵ھ) کہتے ہیں:

۱۔ المیزان الکبریٰ ۵۲/۱

۲۔ اصول البزدوی ۲۱/۱

Marfat.com

''کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی نص ہوتے ہوئے یا اجماع کی صورت میں بھی یہ کہے کہ اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے۔ جس معاملے میں صحابہؓ کی آراء مختلف ہوتی ہیں وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ کتاب وسنت سے کون سی رائے زیادہ قریب ہے، ہم اسی کی روشنی میں اجتہاد کرتے ہیں۔ اجتہاد ان فقہاء پر حلِ مسائل کی راہیں کشادہ کرنے والا ہے جو اختلاف کی نوعیت کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ ہمارے آئمہ اسی اصول اور بنیاد پر قیاس واجتہاد کرتے ہیں''[1]۔

مذکورہ بالا تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو اپنے بارے میں لوگوں کی افترا پردازیوں کا علم ہو چکا تھا، جن کی انہوں نے تردید کی اور خلیفہ منصورؒ کو جو خط لکھا اس میں اپنے موقف کی وضاحت کی۔

ان وضاحتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہؒ کا یہ مسلک ہرگز نہ تھا کہ قیاس کو حدیث پر مقدم رکھا جائے۔ فقہائے مجتہدین میں سے کسی کا بھی یہ مسلک نہیں رہا کہ قیاس ظنی کو حدیثِ صحیح پر ترجیح دی جائے۔

امام ابوحنیفہؒ کی طرف جو بات منسوب کی گئی کہ وہ قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں، اس کی وجہ اس کے سوا اور کوئی نہیں معلوم ہوتی کہ وہ ہمیشہ کوفہ میں رہے، وہیں انہوں نے اپنی مجلس اجتہاد کی بنیاد رکھی، ان کے اجتہاد اور تدوین فقہ کا تمام عمل جو کم وبیش بائیس برس بعد پر پھیلا ہوا ہے، کوفہ میں پایہ تکمیل تک پہنچا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اگر کسی حدیث کو نظر انداز کر کے قیاس کیا تو بہت ممکن ہے کہ وہ حدیث ان تک یا کوفہ اور عراق کے اہلِ علم تک نہ پہنچی ہو، اگر پہنچتی تو وہ قیاس سے مدد نہ لیتے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حدیث موجود ہو اور امام ابوحنیفہؒ کو اس کا علم بھی ہو مگر وہ ان کی شرائط پر پوری نہ اترتی ہو۔ کیونکہ حدیث کو قبول کرنے میں وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے نقش قدم پر چلتے تھے۔

۱۔ مناہج الاجتہاد ص ۱۲۵

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اپنے فقہ کی اساس اور ڈھانچہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے فتاویٰ اور قضایا پر اٹھایا۔ حضرت علیؓ کا عہدِ خلافت اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زندگی کا قابل ذکر حصہ کوفہ میں گزرا اور کوفہ ان حضرات کے علوم وفنون سے مالا مال ہوگیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اجتہاد وفتویٰ میں حضرت عمرؓ کے نقش قدم پر چلتے تھے اور تابعین میں سے قاضی شریحؒ (م ۸۷ھ)، علقمہؒ (م ۶۲ھ) اور مسروقؒ (م ۶۳ھ) نے ان بلند قدر فقہائے صحابہؓ کے قوال وآراء کی خوب اشاعت کی تھی۔ نیز امام ابراہیم نخعیؒ (م ۹۵ھ) نے ان تمام بزرگ ہستیوں سے فیض حاصل کیا تھا۔ پھر امام ابراہیم نخعیؒ کے واسطہ سے ان بزرگوں کی علمی وراثت امام ابوحنیفہؒ کے شیخ امام حمادؒ (م ۱۲۰ھ) کی طرف منتقل ہوگئی، جیسا کہ ان کے واسطہ سے امام شعبیؒ (م ۱۰۴ھ) کی فقہ کا خزانہ ان کے ہاتھ لگ گیا جو اہلِ اثر کے مسلک سے زیادہ قریب تھا۔ امام حمادؒ پر امام نخعیؒ کا مسلک غالب رہا جو حضرت عمر فاروقؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ کی فقہ پر مشتمل تھا۔

جب امام ابراہیم نخعیؒ کی وساطت سے ان آئمہ ثلاثہ کی فقہ امام حمادؒ کی طرف منتقل ہوئی اور امام حمادؒ کے بعد امام ابوحنیفہؒ نے اس ورثہ کو سنبھالا تو لازمی طور پر نقدِ احادیث میں ان بزرگوں کا طرز فکر اور نقل روایت میں دقتِ نظر اور احتیاط کا خیال بھی ان کی طرف منتقل ہوگیا۔

اِجماع کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا موقف

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ اصولی طور پر اجماع تمام فقہاء کے نزدیک حجت اور قابلِ استدلال ہے۔ البتہ آئمہ اربعہ کا اس بات میں اختلاف ہے کہ کس قسم کا اجماع اور کن لوگوں کا اجماع حجت ہے؟ اس کی وضاحت آپ ہر امام کے اصولِ اجتہاد کی بحث میں پڑھ سکیں گے۔ یہاں امام ابوحنیفہؒ کا نقطۂ نظر پیش کیا جارہا ہے کہ وہ کس حد تک اجماع کو مصدرِ قانون کے طور پر تسلیم کرتے تھے۔

علمائے احناف کا کہنا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب ہر قسم کے اجماع کو حجت مانتے تھے۔ وہ جس طرح اجماع قولی کو معتبر مانتے تھے اسی طرح اجماع سکوتی کی حجیت کے بھی قائل تھے۔ بلکہ وہ اس بات کو بھی اجماع کے خلاف تصور کرتے تھے کہ کسی مسئلے میں علماء کے دو اقوال ہوں اور کسی

Marfat.com

دور میں بھی کسی صاحبِ علم نے ان سے اختلاف نہ کیا ہو، اس کے بعد ایک شخص آئے اور ایک تیسرا مسلک اختیار کرے جو پہلے دونوں مسلکوں سے کسی طرح بھی مطابقت نہ رکھتا ہو۔

فقہائے احناف کے نزدیک اجماع سکوتی رخصت کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ اہلِ حل وعقد یا اہل اجتہاد میں سے کوئی شخص کسی مسئلے میں استقرار مسالک سے قبل ایک فتویٰ دیتا ہے اور اس فتویٰ کی شہرت کے باوجود کسی شخص کی طرف سے اس کی مخالفت ظاہر نہیں ہوتی اور تاویل کی مدت بھی گزر جاتی ہے۔ اجماعِ سکوتی عملی مسائل میں بھی ہوتا ہے۔ مثلاً اہلِ اجماع میں سے ایک شخص ایک عمل کرتا ہے اور اس زمانے کے اہلِ علم اس عمل سے باخبر ہونے کے باوجود اس کا انکار نہیں کرتے۔ اس طرح تاویل وتفسیر کی مدت گزر جاتی ہے اور کسی حلقے سے اس کی مخالفت نہیں کی جاتی۔ اس طرح فقہائے احناف اجماع سکوتی کو حجت قرار دیتے ہیں۔ گو اس اجماع کی بنیاد کسی فعل پر کیوں نہ ہو، یعنی اس اجماع کے لیے قول کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

فخر الاسلام بزدویؒ (م ۴۸۲ھ) لکھتے ہیں:

> ''تمام اہلِ علم کا کسی ایک مسئلے پر قولی طور پر اظہارِ اتفاق کرنا عادتاً بہت دشوار ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کبار اہلِ علم فتویٰ دیتے چلے جاتے ہیں اور دوسرے اہلِ علم اسے تسلیم کرتے جاتے ہیں اور کسی مسئلے کے سامنے آنے کے بعد اگر کوئی شخص سکوت اختیار کرتا ہے تو سکوت ہمارے نزدیک تسلیم کا قائم مقام ہے، کیونکہ ایسے موقع پر اختلاف کے باوجود سکوت اختیار کرنا شرعاً حرام ہے''[1]۔

فخر الاسلام بزدویؒ نے اجماع کی تفصیل کرتے ہوئے اس کے تین تدریجی مراتب قائم کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

۱- پہلے درجے میں اجماعِ صحابہؓ ہے اور یہ حدیث متواتر اور دوسرے قطعی دلائل کی طرح قطعیت کا فائدہ دیتا ہے۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ وہ ہیں جنہوں نے نزولِ وحی کا مشاہدہ کیا ہے اور وہ کلام اللہ کے اوّلین مخاطب ہیں۔

۱۔ اصول البزدوی ۲/۲۴۲

Marfat.com

۲- دوسرا درجہ تابعین کے اجماع کا ہے جو کسی ایسے امر میں ہو جس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ اجماع حدیث مشہور یا مستفیض کا حکم رکھتا ہے جو ثبوت کے لحاظ سے تو ظنّی مگر عملاً قطعی ہوتی ہے۔

۳- تیسرے درجے میں تابعین کا اجماع کسی ایسے امر میں ہے جس میں اجتہاد کی گنجائش ہو۔ یہ اجماع احادیث (خبر واحد) کی قبیل سے ہوگا جو ہر لحاظ سے ظنّی ہوگا اور اس میں شبہ کی گنجائش نکل سکتی ہے[1]۔

اجماع کے یہ تینوں درجے اس صورت میں ہیں جب وہ بطریق تواتر منقول ہوں، لیکن خبرِ اجماع بطریقِ آحاد منقول ہو تو خواہ وہ اجماعِ صحابہؓ ہی کیوں نہ ہو، موجبِ یقین نہیں ہوگا۔ کیونکہ اجماعِ صحابہؓ بذاتِ خود قطعیت کا فائدہ دیتا ہے مگر جب وہ طریقِ آحاد سے منقول ہو تو اس پر ظنّیت غالب ہوگئی اور وہ احادیث آحاد کے درجے پر اتر آئے گا۔ جیسا کہ فرامینِ نبوی بذات خود موجبِ یقین ہوتے ہیں مگر جب وہ ہم تک طریقِ آحاد سے پہنچتے ہیں تو نقل کے بعد وہ ظنّی ہو جاتے ہیں۔ البتہ اجماع کسی صورت میں بھی ہو، قیاس پر بہر صورت مقدم ہوگا۔

قیاس واستحسان کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا موقف

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے مقدم رکھتے تھے۔ ان دونوں مصادر میں کوئی حکم نہ ملتا تو صحابہؓ کے فتاویٰ اور قضایا کی طرف دیکھتے تھے، وہاں سے بھی رہنمائی نہ ہوتی تو پھر قیاس اور اس کے بعد استحسان کی طرف قدم بڑھاتے تھے۔ مگر اپنے اس اختصاص کو ہر مرحلے پر قائم رکھتے تھے کہ مصلحتِ عامہ اور دین میں رفعِ حرج کی اصل کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اسی اصل اور اساس پر پختگی نے انہیں قیاس سے ایک قدم آگے بڑھا کر استحسان پر مجبور کیا تھا۔ وہ جب قیاس کو لوگوں کے معاملات کے ساتھ ہم آہنگ نہ پاتے تو استحسان کو کام میں لاتے اور اس کی مدد سے مسائل کا حکم اخذ کرتے۔ قیاس اور استحسان سے کام لیتے وقت بھی

۱۔ اصول البزدوی ۲/۲۴۲

Marfat.com

ان کی نظر عرف و عادت اور عام لوگوں کے تعامل پر ہوتی تھی اور اپنے اجتہاد میں وہ امکانی حد تک اسے بھی پیش نظر رکھتے تھے۔

حنفی مسلک کی ترویج و اشاعت

حنفی مسلک کی داغ بیل کوفہ میں پڑی، وہیں یہ پروان چڑھا۔ ۱۵۰ ہجری میں امام ابوحنیفہؒ کی وفات ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے تلامذہ اور حلقہ کے علماء نے اس کی تعلیم و تدریس کا آغاز کیا۔ بغداد فقہ حنفی کی تعلیم و اشاعت کا اوّلین مرکز بنا۔ اس کے بعد اس کی اشاعتِ عام شروع ہوئی اور مسلم دنیا کے تقریباً تمام حصوں میں اس کی پیروی شروع ہوگئی۔

فقہ حنفی کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں بعض حلقوں کی طرف سے یہ بات زور دے کر کہی گئی کہ اس کے قبولِ عام میں حکومت اور اقتدار کے سہارے کو بہت بڑا دخل ہے، کیونکہ اس کے سب سے اہم رکن قاضی ابو یوسفؒ (م ۱۸۲ھ) خلافتِ عباسیہ میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے عہدے پر فائز کیے گئے، انہوں نے حنفی مسلک کی سرپرستی کی۔

حنفی مسلک کی ترویج و اشاعت اور عالم اسلام میں اس کی قبولیت کے اسباب، حکومت و اقتدار کے اثر و رسوخ اور اس کی سرپرستی سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع ہیں۔ باقی تین آئمہ مجتہدین کے مسالک کی اشاعت اور قبولیت کی بنیادی وجہ ان کی ذاتی خصوصیات تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مسلک زیادہ تر وہیں پھیلا جہاں وہ اقامت پذیر رہے۔ امام ابوحنیفہؒ کو یہ خصوصیت حاصل نہیں تھی کہ ان کی علمی زندگی مرکزِ نبوت (مدینہ منورہ) میں گزری ہو جیسا کہ امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ) کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ ان کی پوری زندگی مرکزِ نبوت میں گزری۔ وہاں کے فقہاء اور محدثین سے انہوں نے استفادہ کیا، عالم اسلام کے ہر علاقے سے اہلِ علم مدینہ منورہ آتے اور امام مالکؒ کے علم و فضل سے روشناس ہوتے تھے۔ ان کے حلقہ درس میں شریک ہونے کا موقع ملتا تھا۔ امام مالکؒ بھی ان سے تبادلہ افکار و خیالات کرتے تھے۔ آج کی دنیا میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی ماہر فن اپنے ملک کے مرکزی شہر میں بیٹھ کر جو کام کر سکتا ہے وہ کسی دوسرے یا تیسرے درجہ کے شہر میں بیٹھ کر کرنا ممکن نہیں

Marfat.com

ہوتا اور کسی ماہر فن کی اپنی حیثیت بھی صحیح معنی میں مرکزی جگہ ہی میں اجاگر ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اس خصوصیت سے محروم تھے۔

کسی اہم اور غیر معمولی کام کی انجام دہی میں خاندانی پس منظر بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ فضیلت امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) کو حاصل تھی۔ وہ ہاشمی النسب ہونے کے ساتھ ساتھ عربی النسل بھی تھے۔ اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) عربی النسل تھے مگر امام ابوحنیفہؒ کو ان میں سے کوئی فضیلت اور امتیاز حاصل نہ تھا۔ نہ وہ قریشی یا ہاشمی النسب تھے اور نہ عربی النسل، حتی کہ ان کے خاندان میں کوئی عالم بھی نہ تھا۔ نہ کوئی ایسا شخص تھا جو مسلم معاشرے میں کسی غیر معمولی حیثیت کا حامل ہوتا۔ ان کے اجداد میں کوئی سیاسی اثر ورسوخ کا مالک بھی نہ تھا۔ آپ کا آبائی پیشہ تجارت تھا، خود بھی تمام عمر اس پیشہ سے وابستہ رہے اور کاروبار کے ذریعے کسب معاش کیا۔ آباؤ اجداد ایران سے آ کر کوفہ میں آباد ہو گئے تھے۔ اس وقت حضرت علیؓ کا دور خلافت تھا۔ جو اہلِ علم رائے اور اجتہاد کے مقابلہ میں ظاہر حدیث پر عمل کو ترجیح دیتے تھے وہ ان کے سخت خلاف تھے اور سیاسی سطح پر حکومتِ وقت سے ہمیشہ ان کا ٹکراؤ رہا، چہ جائیکہ یہ کہا جائے کہ انہیں حکومتِ وقت کی سرپرستی حاصل ہوئی اور اس کے زیر سایہ ان کا مسلک پروان چڑھا۔ غرض حسنِ قبول اور اشاعتِ عام کے لیے جتنے خارجی اسباب اور محرکات ہو سکتے ہیں، امام ابوحنیفہؒ ان سب سے محروم تھے۔ اس کے باوجود ان کا مسلک صرف اس علاقے میں محدود نہیں رہا جہاں وہ اور ان کے تلامذہ اقامت پذیر رہے اور جہاں اس مسلک کی ترتیب وتدوین عمل میں آئی بلکہ یہ دنیائے اسلام کے اکثر حصوں میں پھیل گیا۔ تیسری صدی ہجری ہی میں حنفی مسلک عراق سے نکل کر شام، مصر، روم، ماوراء النہر، ایران حتی کہ ہندوستان اور چین کے حدود بھی پھاند گیا[1]۔

امام ابوحنیفہؒ کا دور خلافتِ عباسیہ کا دور تھا۔ خلفائے عباسیہ اگرچہ خود اجتہاد کے دعویٰ دار تھے مگر دعویٰ اور حقیقت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ محض دعویٰ پر اگر عمارتیں کھڑی کی جا سکیں تو ہر شخص کچھ نہ کچھ کر گزرے۔ خلفائے بنی عباس اپنے تمام دعووں کے باوجود اس بات پر مجبور ہوئے کہ حنفی مسلک

۱۔ موفق، مناقب امام اعظم ۱۳۲/۲

کو اپنی قلم رو میں قانون حکومت کی حیثیت سے نافذ کریں۔

امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد رشید امام ابو یوسفؒ (م۱۸۲ھ) خلیفہ ہارون الرشیدؒ (م۱۹۳ھ) کے عہد میں منصب قضا پر فائز ہوئے۔ ۱۷۰ھ کے بعد وہ قاضی القضاۃ بن گئے۔ بعض لوگوں نے تو کہا کہ امام ابو یوسفؒ کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) بننے کی وجہ سے خلافتِ عباسیہ میں مذہب حنفی کو فروغ حاصل ہوا، لیکن یہ بات حقیقت سے بہت مختلف ہے۔ خلافت عباسیہ کی نظر میں امام ابوحنیفہؒ ایک پسندیدہ شخصیت نہیں تھے۔ ان کے ساتھ حکومت کا جو سلوک رہا وہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ پھر یہ کہنا کہاں تک بجا ہے کہ حنفی فقہ خلفائے عباسیہ کی سرپرستی کے سبب پھیلا - ایک ایسی وسیع حکومت کے لیے جس کے حدود عراق و حجاز سے افریقہ کے شمال اور ایشیا کے وسط تک پھیلے ہوئے تھے، حنفی مسلک کو اپنانے کی بنیادی وجہ اس کی جامعیت اور اس کا عقلی اور اجتماعی انداز فکر تھا- ان کے ایک شاگرد امام (ابو یوسفؒ) کو چیف جسٹس کے اعلیٰ اور اہم منصب پر فائز کرنے کی تہ میں بھی یہی حقیقت کارفرما تھی کہ اس وقت وہی اس منصب کے سب سے زیادہ اہل تھے۔ ٹیکس اور مال گزاری سسٹم پر اپنی شہرہ آفاق کتاب کتاب الخراج لکھ کر انہوں نے اپنی اعلیٰ ترین اہلیت کا ثبوت دیا۔ پوری خلافت عباسیہ میں حنفی مسلک کا اثر و رسوخ اس حد تک بڑھا کہ جب خلافت عباسیہ کا زوال شروع ہوا اور حکومت کمزور پڑی اور بالآخر ایک روز اس کا شیرازہ بکھر گیا، تب بھی اس کا اثر و نفوذ برابر قائم رہا بلکہ اسے مسلسل فروغ حاصل ہوتا رہا۔

تیسری صدی ہجری کے آغاز میں جب شافعی مسلک کی بنیاد پڑی تو اگرچہ اس کا اوّلین گہوارہ بھی بغداد تھا مگر فقہ حنفی پر غالب نہ آسکا۔

ابن فرحونؒ (م۷۹۹ھ) کا بیان ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے آخر تک حنفی مسلک افریقہ کے اکثر مسلم علاقوں میں پھیل چکا تھا حتیٰ کہ افریقہ کے حدود سے نکل کر اندلس میں بھی داخل ہو گیا تھا[1]۔

امام شافعیؒ (م۲۰۴ھ) کا آخری زمانہ مصر میں گزرا اور وہیں ان کی فقہ پھلی پھولی مگر اس کے باوجود حنفی مسلک وہاں باقی رہا اور عرصہ تک یہ دستور رہا کہ چار قاضی مقرر ہوتے تھے، ایک حنفی،

۱۔ ابو حنیفۃ حیاتہ و عصرہ ص ۷۰۳ ومابعد

Marfat.com

ایک مالکی، ایک شافعی اور ایک حنبلی مگر سربراہی حنفی کے پاس رہتی تھی۔ یہ صورت حال اس وقت تک قائم رہی جب تک مصر پر فاطمی خاندان قابض نہیں ہوا، فاطمی خاندان کی حکمرانی کے بعد شیعہ مسلک کو سرکاری مذہب کی حیثیت دے دی گئی۔

خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد جن خاندانوں کو عروج حاصل ہوا ان میں اکثر حنفی تھے۔ خاندان سلجوقی جس نے طویل مدت تک حکومت کی اور جن کے دائرہ حکومت کی وسعت ایک طرف کا شغر سے بیت المقدس تک اور دوسری سمت میں قسطنطنیہ سے لے کر بلاد خزر تک پہنچی ہوئی تھی، حنفی المسلک تھا[1]۔

مغلوں کے بعد برصغیر ہند میں جو خاندان برسر اقتدار آئے ان میں اکثر حنفی تھے۔ سلطان محمود غزنویؒ جس کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے، فقہ حنفی کے بہت بڑے عالم تھے۔ فقہ حنفی پر ان کی کتاب التفرید مشہور ہے۔ سلطان نورالدین زنگیؒ تاریخ اسلام کا ایک روشن ستارہ ہے۔ وہ اور ان کا تمام خاندان حنفی مسلک کا پیروکار تھا۔ سلطان زنگیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے مناقب میں ایک کتاب بھی لکھی۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ خود شافعی مسلک کے عامل تھے مگر ان کے خاندان کے اکثر لوگ حنفی تھے۔ چرکسی خاندان جس نے مصر پر تقریباً ڈیڑھ سو سال تک حکومت کی، حنفی المسلک تھا۔ ہندوستان میں آل تیمور کا یہی مسلک تھا[2]۔

سلطنت عثمانیہ کا سرکاری مذہب یہی تھا۔ اسی کی روشنی میں مجلة الاحکام العدلية کی تدوین ہوئی۔ برصغیر ہندوستان میں شہنشاہ عالمگیرؒ (م ۱۷۰۷ء) کے عہد حکومت میں فتاویٰ هندية کے نام سے فقہ حنفی کے مطابق قاضیوں اور مفتیوں کی رہ نمائی کے لیے ایک عمدہ اور ضخیم کتاب مرتب ہوئی جو فتاویٰ عالم گیری کے نام سے مشہور ہے[3]۔

جزوی طور پر حنفی مسلک اسلامی دنیا کے ہر حصے میں موجود ہے مگر ترکی، افغانستان،

۱۔ ابو حنيفة حياته و عصره ص ۷۰۳ ومابعد
۲۔ دائرہ معارف اسلامیہ ۱/۷۸۴
۳۔ موفق، مناقب امام اعظم ۱/۴۶، ۱۲۸

Marfat.com

پاکستان، ہند، بنگلہ دیش، چین، روی ترکستان اور برما کے مسلمانوں کی غالب اکثریت حنفی مسلک کی پیروکار ہے۔ ابتداء میں ایران کے تمام علاقے میں حنفی مسلک چھایا ہوا تھا، بعد میں حکومتی اثر ورسوخ کے ذریعے شیعہ مسلک کو فروغ حاصل ہوا۔ لیکن اس وقت بھی شیعہ مسلک کے بعد مسلمانوں میں سب سے زیادہ پیروکار حنفی مسلک کے ہیں اور ایران کی تقریباً تمام سنّی آبادی حنفی المسلک ہے۔ بقول استاذ محمد ابوزہرہ، حنفی مسلک مشرق ومغرب میں ہر جگہ موجود ہے، اس کے پیروکاروں کی تعداد حدِ شمار سے زیادہ ہے[1]۔ بلاخوف وتردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس وقت پوری دنیا کے سنّی مسلمانوں میں دو تہائی حنفی مسلک کے پیروکار ہیں۔ باقی ایک تہائی آبادی میں تینوں فقہی مسالک (مالکی، شافعی اور حنبلی) کے ماننے والے ہیں۔

اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ کم وبیش یہی تناسب اور صورت حال اہل سنّت کے چاروں فقہی مسالک کے ظہور اور ترویج واشاعت کے بعد سے آج تک قائم ہے۔

فقہ حنفی کی ترویج واشاعت کا اوّلین ذریعہ امام ابوحنیفہؒ کے تلامذہ میں سے بطور خاص یہ اصحاب بنے: امام محمد بن حسن شیبانیؒ (م ۱۸۹ھ)، قاضی ابویوسفؒ (م ۱۸۲ھ)، یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہؒ (م ۱۸۴ھ)، یحییٰ بن سعید القطانؒ (م ۱۹۸ھ) اور وکیع بن الجراحؒ (م ۱۹۷ھ)[2]۔

بعد کے ادوار میں جن اہل علم وفضل نے تصنیف وتالیف کے ذریعے فقہ حنفی کو نہ صرف زندہ رکھا اور اس کی ترویج واشاعت کا ذریعہ بنے بلکہ اسے اوج کمال تک پہنچایا ان میں یہ حضرات بہت نمایاں ہیں: ابوبکر محمد بن احمد سرخسیؒ (م ۴۹۰ھ) مصنف المبسوط، ابوبکر بن مسعود بن احمد علاء الدین کاسانیؒ (م ۵۴۰ھ) مولف بدائع الصنائع، برہان الدین علی بن ابی بکر مرغینانیؒ (م ۵۹۳ھ) مولف الھدایۃ، حافظ الدین نسفیؒ (م ۷۱۰ھ) مولف کنز الدقائق، محمد بن عبدالواحد کمال الدین شہیر بابن ہمامؒ (م ۸۶۱ھ) صاحب فتح القدیر، محمود بن احمد بدرالدین عینیؒ (م ۸۵۵ھ) مولف رمز الحقائق شرح کنز الدقائق، فخر الدین عثمان بن علی زیلعیؒ

۱۔ ابوحنیفۃ حیاتہ و عصرہ (اُردو ایڈیشن)

۲۔ الفقہ الاسلامی ص ۱۳۲، ۱۳۳

(م۷۶۲ھ) مولف تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، زین العابدین بن ابراہیم بن محمد بن نجیمؒ (م۹۷۰ھ) مولف الاشباہ والنظائر، محمد بن اعلی حصکفی دمشقیؒ (م۱۰۸۸ھ) مولف درمختار، سید محمد امین ابن عمر عابدین (م۱۲۵۲ھ) مولف ردالمحتار معروف فتاویٰ شامیة۔

[ڈاکٹر محمد میاں صدیقی]

مصادر و مراجع

۱۔ ابن حجر، احمد بن محمد بن علی (م۸۵۶ھ)، الخیرات الحسان، طبع القاهرة ۱۳۲۴ھ

۲۔ ابن کثیر، عمادالدین اسماعیل بن عمر (م۷۷۴ھ)، البدایة والنهایة، مطبع السعادة، القاهرة ۱۳۴۱ھ

۳۔ بزدوی، ابوالحسن علی بن محمد بن حسین (م۴۸۲ھ)، اصول البزدوی، طبع قسطنطنیة ترکی ۱۳۰۷ھ

۴۔ خطیب بغدادی، ابوبکر احمد بن علی (م۴۶۳ھ)، تاریخ بغداد، مطبع السعادة، القاهرة ۱۹۳۱ء

۵۔ دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور۔

۶۔ ذہبی، شمس الدین محمد عثمان (م۷۴۸ھ)، تذکرة الحفاظ، طبع حیدرآباد دکن، بھارت ۱۹۵۵ء

۷۔ شعرانی، عبدالوہاب (م۹۷۳ھ)، المیزان الکبری، طبع القاهرة مصر ۱۹۷۹ء

۸۔ کردی، محمد بن شہاب، مناقب امام اعظم، طبع دائرة المعارف، حیدرآباد دکن ۱۳۲۲ھ

۹۔ محمد ابوزہرہ، ابو حنیفة حیاته و عصره، طبع دارالفکر العربی، القاهرة

۱۰۔ محمد سلام مدکور، مناهج الاجتهاد، طبع دارالنهضة العربیة، القاهرة مصر ۱۹۶۰ء

۱۱۔ موسیٰ، محمد یوسف، الفقه الاسلامی، طبع دارالکتب العربی، مصر ۱۹۵۸ء

۱۲۔ موفق ابن احمد مکی، مناقب امام اعظم، طبع دائرہ المعارف، حیدرآباد دکن ۱۳۲۲ھ

۱۳۔ نووی، ابوزکریا محی الدین یحییٰ بن اشرف (م۶۷۶ھ)، شرح مسلم، طبع کراچی

Marfat.com

فصل دوم

فقہ مالکی اور اس کے اصولِ اجتہاد

فقہ مالکی کے بانی

فقہ مالکی کے بانی کا نام مالک اور کنیت ابوعبداللہ ہے۔ امام دارالہجرت کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے: مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمر بن حارث بن غیمان بن جثیل بن عمرو بن حارث [1]۔

یمن کے آخری شاہی خاندان حمیر کی شاخ ''اصبح'' سے آپ کا تعلق تھا۔ یمن میں آپ کا خاندان دورِ جاہلی اور دورِ اسلام دونوں میں معزز و محترم رہا۔

آپ کے خاندان میں سب سے پہلے آپ کے پردادا حضرت ابو عامرؓ مشرف با اسلام ہوئے۔ بعض روایات کی بناء پر اس شرف اندوزی کی تاریخ خاصی قدیم ہے یعنی سنہ ۲ ہجری۔ قاضی ابوبکر بن العلاءؒ کا کہنا ہے کہ حضرت ابو عامرؓ غزوہ بدر کے علاوہ دوسرے تمام غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے۔

محدثین اس روایت کو تسلیم نہیں کرتے۔ محدث ذہبیؒ (م ۷۴۸ھ) کہتے ہیں کہ میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس نے امام مالکؒ کے پردادا حضرت ابو عامرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں شمار کیا ہو [2]۔ البتہ امام مالکؒ کے دادا حضرت مالک بن ابی عامرؓ کے بارے میں

۱۔ تنویر الحوالک ۱/۶

۲۔ تذکرۃ الحفاظ

Marfat.com

اتفاق ہے کہ وہ تابعی تھے اور صحاح ستہ کے راویوں میں داخل ہیں۔ حضرت عثمانؓ سے ان کو ایک گونہ تعلق تھا۔ چند سربکف نوجوانوں اور مخلصوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ان کے جسد کو باغیوں اور دشمنوں کے قبضے سے نکال کر دفن کرنے کی خدمت انجام دی تھی، ان میں یہ بھی تھے۔ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں افریقہ میں جو جنگیں لڑی گئیں ان میں بھی انہوں نے حصہ لیا[1]۔ روایتِ حدیث میں انہیں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت حسان بن ثابتؓ، اور حضرت عائشہؓ سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ الموطا میں بھی ان کی روایت سے حدیث ہے۔ امام نسائیؒ (م ۳۰۳ھ) نے ان کی توثیق کی ہے۔ ان کی علمی و دینی بصیرت اور سیاسی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے دور حکومت میں بعض اہم سرکاری معاملات میں ان سے مشورے لیا کرتے تھے۔ طویل عمر پائی۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ان کا سال وفات ۱۰۴ ہجری ذکر کیا ہے[2]۔

پیدائش، نشو ونما

امام مالکؒ کے سن پیدائش میں اختلاف ہے۔ اکثر اہل علم نے ۹۳ھ کو اختیار کیا ہے کیونکہ یہ تاریخ امام مالکؒ کے خاص شاگرد یحییٰ بن بکیرؒ کی بیان کردہ ہے جو برسوں امام صاحب کی خدمت میں رہے[3]۔

حلیہ اور لباس

تذکرہ نگاروں نے امام مالکؒ کا حلیہ کچھ اس طرح بیان کیا ہے: دراز قد، بھاری جسم، رنگ سفید سرخی مائل، آنکھیں بڑی، خوبصورت، اونچی اور ستواں ناک، پیشانی میں سر کے بال کم تھے۔ ایسے شخص کو عربی میں اصلع کہتے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی اصلع تھے۔ داڑھی گھنی اور لمبی، مونچھوں کے ان بالوں کو جو لبوں کے کناروں پر ہوتے ہیں، کتروا تے تھے۔ مونچھیں مڈوانے کو مکروہ

۱۔ حیات مالک ص ۱۴
۲۔ حوالہ بالا
۳۔ حوالہ بالا ص ۴۰

سمجھتے تھے۔ فرماتے کہ مونچھ کا مُنڈوانا مثلہ کرانے کے مترادف ہے، مونچھیں بھی ذرا لمبی رکھتے۔ اس میں حضرت عمرؓ کی پیروی کرتے تھے۔ ان کے بارے میں منقول ہے کہ حضرت عمرؓ کو جب کوئی مشکل درپیش ہوتی اور کسی اہم معاملے میں سوچ بچار کرتے تو اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا کرتے تھے۔

بڑھاپے میں کبھی بالوں میں خضاب نہیں کیا۔ بہت خوش پوشاک تھے۔ لباس کے معاملے میں امام صاحب کا ذوق اتنا نازک اور بلند تھا کہ موٹے جھوٹے کپڑے نہیں پہنتے تھے۔ اکثر سفید رنگ کا لباس پہنتے اور بہترین خوشبو استعمال کرتے، کوئی اس اہتمام کا سبب پوچھتا تو جواب دیتے کہ جس شخص کو اللہ نے فراخی عطا کی ہو اور اپنا مال و دولت دیا ہو کہ وہ اچھا کھا سکے اور اچھا پہن سکے تو اس کو ضرور اپنے آپ کو باوقار طریقہ سے رکھنا چاہئے۔ جس شخص پر اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت کا اثر ظاہر نہ ہو تو اللہ ایسے آدمی کو پسند نہیں کرتا کیوں کہ اس نے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو چھپا کر کفرانِ نعمت کیا ہے۔

امام مالکؒ کا شمار عبادِ زمانہ میں تھا۔ درس حدیث اور افتاء سے جو وقت فارغ ملتا وہ نوافل اور تلاوت کلام پاک میں صرف ہوتا۔ کسی نے ان کی بیٹی سے پوچھا: امام صاحب کی گھر میں کیا مصروفیات ہیں تو انہوں نے جواب دیا: نوافل اور تلاوتِ قرآن، جمعہ کی پوری رات عبادت الٰہی میں گزرتی ہے۔

حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ مجھے اپنی ذات سے، اپنے ماں باپ سے اور دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ رکھے۔ جس کو جس درجہ ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہوگی اس کا اسی درجہ کا ایمان ہوگا۔ اس بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو جس درجے کا مومن ہوگا اس کو ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی ہی زیادہ محبت ہوگی۔

امام مالکؒ ایمان کے بھی اعلیٰ درجے پر فائز تھے اور حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ان کے رتبے کو پالینا بہت دشوار تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک

Marfat.com

زبان پر آتا تو چہرہ کا رنگ پیلا پڑ جاتا۔ لوگ پوچھتے تو فرماتے کہ ہم نے جن نفوس قدسیہ کی زیارت کی ہے ان کی حالت مجھ سے بھی بڑھ کر تھی۔

مدینہ میں کبھی سوار ہو کر نہیں چلتے تھے۔ لوگ وجہ دریافت کرتے تو فرماتے: جن گلی کوچوں سے اور جن جن جگہوں سے رسول اقدس گزرے ہوں اور وہاں آپ کے پائے مبارک رکھے گئے ہوں، مجھے شرم آتی ہے کہ میں ان مقامات سے کسی سواری پر سوار ہو کر گزروں۔ سواری پر سوار ہو کر گزرنا تو بڑی بات ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب واحترام کی یہ کیفیت تھی کہ امام مالکؒ مدینہ کی گلیوں اور بازاروں میں جوتے پہن کر بھی نہیں نکلتے تھے۔

حدودِ حرم میں قضائے حاجت نہ کرتے، حرم سے باہر نکل جاتے اور وہاں بھی یہ حالت ہوتی کہ چہرے کا رنگ پیلا پڑ جاتا، خوف سے کانپنے لگتے اور فرماتے ''مجھے ڈر لگتا ہے کہ میں جس جگہ قضائے حاجت کے لیے بیٹھا ہوں یہاں کسی صحابی کا جسد مبارک دفن نہ ہو اور مجھ پر اللہ کا عذاب نازل ہو جائے۔'' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نے امام مالکؒ پر عجیب کیفیت طاری کر دی تھی۔

جس کمرے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ انور ہے اس کے قریب لوگوں کو اونچی آواز سے بولنے نہ دیتے اور فرماتے ''یہ آستانہ نبوت سے گستاخی ہے'' اور یہ آیت پڑھ کر سناتے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (الحجرات ۴۹: ۲)

اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند نہ کرو اور آپ سے تڑخ کر نہ بولو جیسے تڑختے ہو ایک دوسرے پر۔ کہیں تمہارے سارے اعمال اکارت نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

Marfat.com

علمی زندگی کا آغاز

امام مالکؒ نے ہوش سنبھالا تو اپنے کو علم کے آغوش میں پایا۔ خود گھر اور گھر سے باہر تمام شہر اہلِ علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ اگر چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بہت سے صحابہؓ مدینہ سے نکل کر دوسرے شہروں اور علاقوں میں چلے گئے تھے لیکن کہتے ہیں کہ معدن، سونا نکلنے کے بعد بھی معدن رہتا ہے۔ عہد نبوی میں اور پھر عہد نبوی کے بعد بھی مدینہ پچیس برس تک خلافتِ راشدہ اور اسلامی ریاست کا مرکز رہا۔ اکابر صحابہؓ جو علومِ قرآن وسنت کے حامل وامین تھے، نے اسی شہر میں زندگی بسر کی، یہیں سنت نبوی کی خدمت کی اور یہیں سے یہ نور اطراف واکناف میں پھیلا۔ یہیں سے احکام وفتاوی، فقہائے صحابہؓ کی مجلس میں طے ہو کر تمام دنیائے اسلام میں پھیلتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں جن مسائل میں اجماع ہوا، اس کا شرف بھی مدینہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا۔ اس اجماع میں فقہائے مدینہ کی حیثیت بنیادی پتھر کی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ جو اسرارِ شریعت کے رازداں تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال وسنن کا متبع اور واقف کون ہوسکتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ جو خیر امت تھے، حضرت ابو ہریرہؓ سے بڑھ کر حدیث کا کوئی راوی اور حافظ نہ تھا، حضرت زید بن ثابتؓ کاتب وحی تھے، ان سب کی درس گاہیں مدینہ میں آباد تھیں جہاں دور دور سے لوگ آ کر وحی وسنت کا علم حاصل کرتے تھے۔

ان اکابر کے علاوہ جن کا علم مدینہ سے پھیلا، ان میں مکتب صدیقؓ کے وارث حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ اور حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کے بیٹے حضرت عروہؒ، مسند فاروقؓ کے جانشین حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کے داماد حضرت سعید بن مسیبؒ بہت نمایاں ہیں۔ امام مالک انہی بزرگوں کے علمی وارث بنے۔

امام مالکؒ کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ انہوں نے بعض دوسرے فقہاء اور

Marfat.com

محدثین کی طرح مختلف شہروں اور علاقوں کے سفر نہیں کیے۔ امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام بخاریؒ نے حصول علم کی خاطر بہت زیادہ سفر کیے۔

امام مالکؒ کی ساری زندگی مدینہ میں گزری۔ وہ صرف ایک بار مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے باہر گئے اور وہ بھی فرض حج کی ادائیگی کے لیے، لیکن ان کے ایک ہی شہر میں رہنے سے ان کے حصولِ علم پر کوئی اثر نہیں پڑا، کیونکہ جن لوگوں نے مختلف شہروں اور علاقوں کا سفر کیا تو اس لیے کہ وہ سفر نہ کرتے تو صرف انہی اہل علم و فضل سے استفادہ کر سکتے جو ان کے شہر میں تھے اور اس طرح وہ علم و فضل کے ان خزانوں سے محروم رہتے جو دوسرے شہروں میں محفوظ تھے۔ امام مالکؒ کا معاملہ ان حضرات سے بالکل مختلف تھا۔ ان کی پیدائش، نشو ونما اور قیام مدینہ میں رہا۔ مدینہ کو یہ فخر اور امتیاز حاصل تھا کہ وہاں تمام عالم اسلام کے علماء اور فضلاء آتے رہتے تھے اور بطور خاص حج کے مہینوں میں۔ بیت اللہ کی حاضری کے بعد روضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری کا شرف اور جذبہ ہر ایک کو وہاں کھینچ لاتا تھا۔ جس کا اپنا گھر اور شہر لعل و جواہر کی کان ہو، اسے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے[1]۔ یہی حال امام مالکؒ کا تھا۔ انہوں نے مدینہ میں رہتے ہوئے بھی نہ صرف حجاز بلکہ شام، عراق اور مصر کے علماء، فقہاء اور محدثین سے بھرپور استفادہ کیا۔

مکتبِ صدیقؓ کے وارثوں اور مسند فاروقؓ کے جانشینوں کے علاوہ مدینہ میں چند اور ممتاز علماء اور مشاہیر بھی تھے۔ مثلاً امام ہشام بن عروہؒ، امام محمد بن منکدرؒ، امام عبید اللہ بن عتبہ بن مسعودؒ، امام محمد بن مسلم بن شہاب الزہریؒ، امام عامر بن عبداللہؒ۔ امام جعفر صادقؒ، امام ربیعہ الرائی، امام ابو سہیلؒ، امام نافع بن مالکؒ اور امام سلیمان بن یسارؒ وغیرہ۔ یہ وہ حضرات تھے جن کی خداداد صلاحیت، محنت اور فضل و کمال کی بدولت دینی علوم نے غیر معمولی ترقی کی[2]۔

یہ تھا گھر اور شہر کا وہ ماحول جس میں امام مالکؒ نے آنکھ کھولی، پروان چڑھے، تعلیم و تربیت پائی اور پھر دنیائے اسلام کے محدث کبیر، فقیہ اور مجتہد بنے۔

۱۔ مالک حیاتہ و عصرہ ص ۲۷، ۲۸

۲۔ حوالہ بالا

Marfat.com

حفظِ قرآن

دینی تعلیم کا سب سے پہلا مرحلہ حفظِ قرآن ہے۔ اس کے بعد تجوید کا مرحلہ آتا ہے۔ امام مالکؒ نے پہلے قرآن کریم حفظ کیا، اس کے بعد امام نافع بن عبدالرحمانؒ (م ۱۶۹ھ) سے عرضاً قراءت سیکھی یعنی امام مالکؒ پڑھتے تھے اور وہ سنتے تھے۔ امام مالکؒ نے حروفِ قرآنی کی ادائیگی میں مہارت حاصل کی۔ امام نافعؒ ان سات قاریوں میں سے ایک ہیں جن کی قراءت کے مطابق قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے۔ یہ تجوید وقراءت میں اہلِ مدینہ کے امام تھے (۱)۔

علمِ حدیث کی طرف توجہ

حفظ قرآن اور علم تجوید وقراءت کے حصول کے بعد امام مالکؒ حصول علم حدیث کی طرف متوجہ ہوئے۔ مدینہ تو علم وحکمت کا چمن زار تھا ہی، امامؒ نے خود اپنے گھرانے کو علم کی طرف رغبت دلانے والا پایا۔ گھر والوں سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ علماء کی مجلسوں میں جائیں اور ان سے علم وادب حاصل کریں۔ والدہ نے یہ بات سنی تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے امامؒ کو نئے کپڑے پہنائے، سر پر عمامہ باندھا اور فرمانے لگیں: جاؤ، ابھی ربیعہ کے پاس جاؤ اور ان سے علم سیکھو (۲)۔

امام مالکؒ کے بعض ہم عصر کہتے ہیں کہ ''جب ہم نے امام مالکؒ کو ربیعہ الرائیؒ کے حلقہ درس میں دیکھا تو وہ بہت چھوٹے تھے اور ان کے کان میں بالی تھی''۔ اس سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ امام مالکؒ نے بچپن ہی میں حصول علم کی ابتداء کر دی تھی۔ اپنے بارے میں خود ان کا بیان ہے ''میں نے نافعؒ (م ۱۱۷ھ) کے پاس اس وقت آنا شروع کیا (حصول علم کے لیے) جب کہ میں چھوٹا تھا''(۳)۔

یہاں جن نافعؒ کا ذکر ہے یہ وہ نافع نہیں ہیں جن سے تجوید وقراءت کا علم حاصل کیا، یہ

۱۔ مالک حیاته و عصره ص ۲۷، ۲۸

۲۔ تذکرة الحفاظ ۱/۲۰۸

۳۔ حیاتِ مالک ص ۲۰

Marfat.com

نافع، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے جو تیس برس حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں رہے۔ ان کے علاوہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت حدیث کی۔ امام اوزاعی، امام ایوب سختیانیؒ، امام ابن جریجؒ، اور امام مالک بن انسؒ جیسے آئمہ حدیث ان سے تلمذ کی نسبت رکھتے ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو خود ایک محدث، مجتہد اور ناقدِ فن تھے، اپنے دورِ خلافت میں حضرت نافعؒ کو اہل مصر کی تعلیم کے لیے بھیجا تھا۔ امام مالکؒ کی عمر چوبیس برس تھی جب حضرت نافعؒ کا (م ۱۱۷ھ میں) انتقال ہوا۔

حضرت نافعؒ جب تک زندہ رہے، امام مالکؒ ان کے حلقہ درس میں حاضر رہے۔ حضرت نافعؒ سے حضرت ابن عمرؓ کے اقوال پوچھتے اور وہ بیان کرتے۔ امام مالکؒ کو حضرت نافعؒ کے ساتھ اپنے علمی ربط و تعلق پر اتنا ناز تھا، کہا کرتے کہ ''جب میں ابن عمرؓ کی حدیث نافعؒ کی زبان سے سن لیتا ہوں تو پھر مجھے اس کی پروا نہیں رہتی کہ کسی اور کی زبان سے بھی اس کی تائید سنوں''۔ امام مالکؒ جس حدیث کو حضرت نافعؒ اور حضرت ابن عمرؓ کے واسطے سے بیان کرتے ہیں، محدثین اس سند کو سلسلة الذهب یعنی سونے کی زنجیر سے تعبیر کرتے ہیں۔

امام ربیعہ الرائیؒ (م ۱۳۶ھ) امام مالکؒ کے استاد ہیں۔ ان کی والدہ نے انہیں سب سے پہلے انہی کے پاس بھیجا تھا اور یہ تاکید کی تھی کہ ''ربیعہ سے صرف علم ہی نہیں ادب بھی سیکھو''۔ چنانچہ امامؒ نے حدیث اور فقہ دونوں میں امام ربیعہؒ سے استفادہ کیا۔

دیگر اساتذہ

امام مالکؒ نے جن شیوخ سے حدیث اور فقہ حاصل کی، ان میں امام ابن ہرمزؒ (م ۱۴۰ھ) کا نام بھی نمایاں ہے۔ امام ابن ہرمزؒ حدیث اور فقہ کے علاوہ علم کلام کے بھی ماہر تھے، اس لیے خیال یہ ہے کہ امامؒ مالک نے ان سے علم کلام میں بھی استفادہ کیا۔ امام ابن ہرمزؒ کے بارے میں امام مالکؒ فرمایا کرتے تھے ''ابن ہرمزؒ ان لوگوں کا رد کرنے میں بہت ماہر اور مستعد ہیں جو ذاتی آراء کے مطابق فیصلے کرنے کے عادی ہیں''[1]۔

۱۔ مالک حیاته و عصره ص ۲۶

Marfat.com

امام ابن ہرمزؒ کی خدمت میں امام مالکؒ سات برس اور بعض روایات کی بنیاد پر آٹھ برس رہے۔ ان سے امام مالکؒ بہت متاثر تھے۔ مجلسوں میں ان کے پاکیزہ کردار کی تعریف کرتے۔ ان کی یہ عادت اور بلند حوصلگی خصوصیت سے بیان کرتے کہ جب ان سے کوئی سوال کیا جاتا اور انہیں اس کا صحیح اور مدلّل جواب معلوم نہ ہوتا تو صاف کہہ دیتے کہ مجھے معلوم نہیں۔ امام مالکؒ کو ان کا یہ طرز اتنا پسند تھا کہ انہوں نے بھی اسے اپنا لیا تھا(۱)۔

امام محمد بن مسلم بن شہاب زہریؒ (م ۱۲۴ھ) سے بھی امام مالکؒ نے علم حاصل کیا۔ صحابہؓ کے بعد تابعین میں جو لوگ روایت و حدیث کے اساطین ہیں، ان میں امام زہریؒ کا رتبہ حضرت سعید بن مسیبؒ کے سوا سب سے بڑھ کر ہے۔ صحاح ستہ، جو بلاشبہ مسلم علماء کے لیے ایک قابل فخر کارنامہ ہے، امام زہریؒ کی روایات سے مالا مال ہے۔ امام ابن حزمؒ کے بعد علم حدیث کے یہ دوسرے مدوّن ہیں۔ فقہائے سبعہ اور شیوخ مدینہ کے سینوں میں جو علم منتشر تھا، امام ابن شہابؒ نے اس کو یک جا کیا اور پھر یہی علم امام مالکؒ کی ذات میں مرتکز ہوا۔

ناقدین حدیث کا کہنا ہے کہ امام زہریؒ سے بڑھ کر حدیث کے متن اور سند کا جاننے والا کوئی نہ تھا۔ امام عمرو بن دینارؒ، امام سفیان بن عیینہؒ، امام اوزاعیؒ اور امام ابن جریجؒ جیسے جلیل القدر محدثین امام زہریؒ کے تلامذہ میں شامل ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ جس نے ان کے نام کو روشن کیا اور ان کے محفوظ کردہ علم کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا وہ امام مالکؒ ہیں۔ امامؒ نے ان سے الموطا میں ۱۳۲ حدیثیں روایت کی ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ رجالِ حدیث کے بہت بڑے ناقد ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے نے پوچھا ''زہریؒ کے شاگردوں میں سب سے زیادہ وثوق اور اعتماد کے قابل کون ہے؟'' امام احمد بن حنبلؒ نے جواب دیا ''مالک بن انسؒ سب سے بڑھ کر ہیں''۔

امام جعفر صادقؒ (م ۱۴۸ھ) جن کا پورا نام جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی

۱۔ جامع بیان العلم و فضلہ ص ۲۲۴

Marfat.com

طالب ہے، امام مالکؒ کے اساتذہ میں ہیں۔ معروف ناقد رجال علامہ ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ امام جعفر صادقؒ جیسی شخصیت کے بارے میں یہ پوچھنا کہ وہ کیسے تھے؟ ان کی شان کو گھٹا دینے کے مترادف ہے۔ ابن حبانؒ کا قول ہے ''امامؒ، سادات اہل بیت، عباد تبع تابعین اور علمائے مدینہ میں سے تھے''۔ یحییٰ بن معینؒ نے ان کو مامون وموثوق کہا ہے۔ امام مالکؒ نے الموطا میں ان کی روایات درج کی ہیں۔

امام محمد بن منکدرؒ (م ۱۳۱ھ) سے بھی امام مالک کا رشتۂ تلمذ ہے۔ اپنے والد منکدر بن عبداللہؒ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابو ایوب انصاریؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ امام زہریؒ اور امام ابو حنیفہؒ جیسے محدث اور فقیہ بھی آپ کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ ابن عیینہؒ کا قول ہے کہ ''محمد بن منکدر صدق و راستی کے معدن تھے''۔

امام ابو حازم سلمہ بن دینارؒ (م ۱۴۰ھ) امام محمد بن یحییٰ انصاریؒ (م ۱۲۱ھ) اور امام ابو سعید یحییٰ بن سعید انصاریؒ (م ۱۴۳ھ) کا شمار بھی امام مالکؒ کے شیوخ اور اساتذہ میں ہوتا ہے[1]۔

مجلسِ درس

امام مالکؒ کے علم وفضل کا اعتراف ان کے اساتذہ اور شیوخ کی موجودگی ہی میں کیا جانے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اپنے شیوخ کے ہوتے ہوئے ان کا الگ اور مستقل حلقہ قائم ہو گیا تھا۔ شیخ الفقہ امام ربیعہؒ (م ۱۳۶ھ) زندہ تھے کہ آپ فقہ وفتویٰ کے مرجع بن گئے تھے۔

امام مالکؒ نے اپنی مجلسِ درس کب آراستہ کی، اس کا تعین کوفہ کے ایک بڑے محدث شعبہؒ کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ ''میں نافعؒ کی وفات کے ایک سال بعد مدینہ آیا تو دیکھا کہ امام مالکؒ ایک حلقہ کے صدر نشین ہیں''۔ نافع کا سال وفات ۱۱۷ھ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالکؒ کے حلقہ درس کا آغاز کم وبیش اسی زمانے میں ہوا۔ امام صاحب کی مجلس درس بہت پر تکلف اور بیش

۱۔ الانتقاء ص ۲۵

قیمت قالینوں سے آراستہ ہوتی، وسط مجلس میں شہ نشین تھا، اس پر املائے حدیث کے وقت رونق افروز ہوتے تھے۔ صفائی کا یہ عالم ہوتا کہ فرش پر کہیں ایک تنکا بھی نظر نہ آتا۔

امام کے کاشانہء علم وفضل پر بارگاہ شاہی کا گمان ہوتا تھا۔ طلبہ کا ہجوم، علماء اور امراء کی حاضری، سیاحوں کا اژدحام اور درخانہ پر سواریوں کی قطاریں دیکھنے والوں پر رعب طاری کر دیتا تھا[1]۔

تلامذہ

امام مالکؒ سے براہ راست استفادہ کرنے والوں کا تعلق کسی خاص علاقے سے نہ تھا۔ مشرق ومغرب کے طالبانِ علوم ان کے درس میں شریک ہوئے اور پھر وہ امام مالکؒ کے علم کو پھیلانے کا ذریعہ بنے۔ مدینہ میں ان کے جن تلامذہ نے ان کے علم اور بطور خاص فقہ کو زندہ رکھا، ان میں عبدالعزیز بن حازمؒ (م ۱۸۵ھ) محمد بن ابراہیم بن دینارؒ (م ۱۸۲ھ) اور معن بن عیسیٰؒ (م ۱۹۸ھ) قابل ذکر ہیں۔

بصرہ میں عبداللہ بن سلمہ مقنیؒ (م ۲۲۱ھ)، نیشاپور میں یحییٰ تمیمیؒ (۲۲۶ھ)، مصر میں عبدالرحمان بن قاسمؒ (م ۱۹۱ھ) عبداللہ بن وہبؒ (م ۱۹۷ھ)، اشہب بن عبدالعزیزؒ (م ۲۴۰ھ) اور عبداللہ بن عبدالحکمؒ (م ۲۱۴ھ)، شمالی افریقہ میں علی بن زیاد تونسیؒ (م ۱۸۳ھ)، عبداللہ بن غانم افریقیؒ (م ۱۹۰ھ) اور اندلس میں ابومحمد یحییٰ بن یحییٰ لیثی اندلسیؒ (م ۲۳۴ھ) نے فقہ امام مالکؒ کی بھرپور نمائندگی کی اور اس کی ترویج اور اشاعت کا ذریعہ بنے۔

وفات

سیوطیؒ، اور زرقانیؒ کے بقول امام مالکؒ نے گیارہ ربیع الاول ۱۷۹ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ بعض نے چودہ، بعض نے گیارہ اور بعض نے دس ربیع الاول تاریخ وفات بیان کی[2]۔ آپ نے چھیاسی سال عمر پائی۔ ساٹھ برس مسند درس اور منصب افتاء پر فائز رہے۔

۱۔ حیاتِ مالک ص ۸۲

۲۔ نظرة عامة فی الفقه الاسلامی ص ۱۵۸

امام مالکؒ کے اصول اجتہاد

امام مالکؒ نے مدینہ کے فقہائے سبعہ [1] سے فقہ حاصل کی، ان کے علاوہ دوسرے اہل علم سے بھی استفادہ کیا۔ فقہ اہل مدینہ کے علاوہ دوسرے علاقوں کی فقہ سے بھی واقفیت حاصل کی، ان کے اصول اور طریق کار کا مطالعہ کیا اور پھر خود دوسروں کو حدیث اور فقہ کی تعلیم دینا شروع کی۔ دور دراز علاقوں سے طالبان علوم آپ کی خدمت میں آتے، آپ ان کو وہی سکھاتے جو آپ نے اپنے بڑوں سے سنا اور سیکھا تھا اور اسی کے مطابق فتوے دیتے۔ اپنے سیکھے اور سنے ہوئے میں سے جواب نہ دے سکتے تو سنے ہوئے میں اس کی نظیر تلاش کرتے اور اس کے مطابق فتوی دیتے۔ کوئی نظیر نہ ملتی تو پھر اجتہاد کرتے اور کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حکم اخذ کرتے۔

امام مالکؒ کا شمار ان محدثین میں ہوتا ہے جنہوں نے تدوینِ حدیث میں پہل کی اور احادیث کا ایک ایسا مجموعہ مرتب کیا جو ایک طرف مجموعہ احادیث تھا اور دوسری طرف اس کی حیثیت ایک فقہی کتاب کی بھی تھی اس میں امام مالکؒ نے مختلف فیہ مسائل میں اپنی فقہی آراء کا اظہار کیا۔ درحقیقت اسی کتاب الموطا سے فقہ امام مالکؒ کی بنیاد پڑی۔

الموطا میں امام مالکؒ نے اہل حجاز کی قوی احادیث کو جمع کیا۔ اس کے ساتھ صحابہؓ اور تابعین کے اقوال اور فتاوی جمع کیے۔ اسے فقہی ابواب پر مرتب کیا اور عام مجموع ہائے احادیث سے اس کی ترتیب اور اسلوب مختلف رکھا۔

امام مالکؒ کو یہ شرف ملا کہ ان کی دونوں حیثیتیں - محدث اور فقیہ - اہل علم کے نزدیک تسلیم کی گئیں۔ امام ابوحنیفہؒ کو جمہور اہلِ علم نے ایک فقیہ اور مجتہد کی حیثیت سے تو بے جھجک مانا اور اس کے معترف ہوئے کہ رائے اور اجتہاد کی وادی میں ان کے قدم سب سے آگے ہیں، مگر انہیں ایک محدث ماننے میں بہت سے اہل علم تذبذب کا شکار ہو گئے۔ امام احمد بن حنبلؒ کی صورت حال امام ابوحنیفہؒ سے

۱۔ مدینہ کے فقہائے سبعہ کے نام یہ ہیں: سعید بن مسیبؒ، عروۃ بن زبیرؒ، قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارثؒ، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعودؒ، خارجہ بن زیدؒ اور سلیمان بن یسارؒ۔ بعض علماء نے فقہائے سبعہ میں ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارثؒ کی بجائے سالم بن عبداللہ بن عمر کا ذکر کیا ہے۔ (مدیر)

Marfat.com

مختلف ہوئی۔ ان کو جلیل القدر محدث تو سب نے مانا لیکن فقیہ و مجتہد ماننے سے بعض اہل علم نے انکار کر دیا۔ بات صرف ترجیح تک رہی۔ بعض نے کہا کہ علمِ حدیث میں ان کا اشتغال زیادہ تھا۔ ان کی نظر مسجد نبوی کے درس حدیث پر تھی۔ الموطا کو بھی انہوں نے مجموعہ حدیث جانا۔ جن حضرات نے ان کے اصولِ اجتہا پر غور کیا اور دیکھا کہ امام ابوحنیفہؒ قیاس سے آگے بڑھ کر استحسان اور عرف و عادت کو مصدرِ تشریع بناتے ہیں، امام مالکؒ بھی ان سے کچھ زیادہ پیچھے نہیں۔ وہ اسی استحسان کو مصالح مرسلہ کے نام سے استنباطِ احکام کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں، یہاں تک کہ علامہ ابن قتیبہؒ نے ان کو فقہائے اہلِ رائے میں شمار کیا[1]۔

کیا امام مالکؒ اہل الرائے تھے؟

امام مالکؒ کو اہل الرائے میں شمار کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت حجاز میں رائے ان اصطلاحی معنی میں مستعمل نہیں تھی جن میں بعد کے ادوار میں ہوئی۔ رائے کے معنی تھے سمجھنا اور خوبی کے ساتھ پالینا، نہ کہ فقہی احکام کے استخراج میں عقل کو کام میں لانے کی قوت۔ اس کی وضاحت خود امام مالکؒ نے کی۔ انہوں نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

> ''رائے سے میری مراد اپنی رائے قطعاً نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ان اہل علم و فضل اور قابلِ اقتداء آئمہ سے سماع ہے جن سے میں نے علم حاصل کیا ایسے بزرگوں کے علم کو میں نے اپنی رائے سے تعبیر کیا ہے۔ درحقیقت ہم نے یہ رائے صحابہ کرامؓ سے وراثتاً پائی ہے۔ چنانچہ یہ میری رائے نہیں ہے بلکہ آئمہ سلف کی ایک جماعت کی رائے ہے۔ جب میں الامر المجتمع علیه کہتا ہوں تو اس سے مراد وہ قول ہوتا ہے جس پر اہل علم و فقہ کا بغیر کسی اختلاف کے اجماع ہو۔ جب میں الامر عندنا کہتا ہوں تو اس سے مراد وہ بات ہوتی ہے جس پر ہمارے ہاں لوگوں کا عمل ہو، جس کے مطابق احکام جاری ہوتے ہوں اور جسے عالم و جاہل سب جانتے ہوں۔ جس چیز کے بارے میں ببلادنا کہتا ہوں تو

۱۔ ترتیب المدارک ۱/۱۹۴

Marfat.com

اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جسے میں اقوال علماء میں سے پسند کرتا ہوں۔ میں
اپنے اجتہاد میں اہل مدینہ کی رائے سے باہر قدم نہیں رکھتا''(۱)۔

امام مالکؒ نے امام شافعیؒ کی طرح باقاعدہ اصول اجتہاد نہ مرتب کیے اور نہ اس بارے میں الگ سے کوئی رسالہ لکھا، بلکہ وہ اس معاملے میں امام ابوحنیفہؒ کے نقش قدم پر چلے۔ استنباط احکام کے جو اصول اور طریقے اہل علم وفقہ میں رائج ہو چکے تھے امام مالکؒ نے اپنے ہم عصر امام ابوحنیفہؒ کی طرح ان سے بھرپور استفادہ کیا اور انہیں کام میں لاتے ہوئے ان معاملات اور مسائل کے احکام معلوم کیے جن کی نشان دہی کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نصوص سے نہیں ہوتی تھی۔

فقہ امام مالکؒ کے ترجمان قاضی عیاضؒ، امام مالکؒ کے اصولِ اجتہاد کی بحث میں لکھتے ہیں:

''امام مالکؒ کے ادلہ بڑے مربوط اور طریقِ اجتہاد انتہائی عقلی اور منطق ہے۔ وہ کتاب اللہ کو دوسرے تمام آئمہ مجتہدین کی طرح سب سے مقدم رکھتے تھے۔ کتاب اللہ سے استدلال کے بارے میں ان کا طریق کار یہ تھا کہ وہ نصوص قرآن کو اوّلیت دیتے، پھر ظواہر کو لیتے اور تیسرے درجے میں مفاہیم سے استدلال کرتے''۔

''کتاب اللہ کے بعد سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مصدر تشریع مانتے ہیں۔ سنت کو دلیل اور مصدر تشریع ماننے میں بھی ان کا موقف بڑا اصولی اور منطقی ہے۔ ہر قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عمل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ ایک درجہ پر نہیں رکھتے۔ احادیث کو سند کے اعتبار سے اصولیین نے جن اقسام میں تقسیم کیا ہے، اس کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ سنت میں وہ خبرِ متواتر کو اوّلیت دیتے ہیں، پھر خبر مشہور، اس کے بعد خبر واحد۔ پھر احادیث میں بھی انہی تین مراتب کو معتبر مانتے ہیں جنہیں کتاب اللہ میں معتبر مانا تھا، یعنی پہلے نصوص، پھر ظواہر اور اس کے بعد مفاہیم سے استدلال کرتے ہیں''(۲)۔

۱۔ ترتیب المدارک ۱/۱۷۷، ۱۷۸

۲۔ الاعتصام ۱/۳۱۲

قاضی عیاضؒ (م۵۴۴ھ) نے امام مالکؒ کے اصولِ اجتہاد میں کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عملِ اہلِ مدینہ اور قیاس کو ذکر کیا مگر اجماع کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ مدینہ کے عمل اور اتفاق ہی کو امام مالکؒ اجماع سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے نزدیک فقہائے مدینہ کا اجماع ہی دراصل اجماع ہے۔ اس لیے قاضی عیاضؒ نے الگ سے اجماع کا ذکر نہیں کیا۔ گویا اجماع اور عملِ اہلِ مدینہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

تعاملِ اہلِ مدینہ اور اجماع فقہائے صحابہؓ سے باہر نہ جانے کے سبب امام مالکؒ کے بارے میں بعض اہل علم نے یہاں تک کہا کہ امام مالک نے اپنی فقہ میں اپنے آپ کو فقہائے مدینہ کا ایک حد تک تابع کر لیا تھا کہ بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ پچھلوں کے مقلد تھے (۱)۔

قاضی عیاضؒ اور دوسرے علمائے اصول نے فقہ امام مالکؒ کے جو اصول بیان کیے ہیں ان کی ترتیب کچھ اس طرح ہے:

۱-کتاب اللہ	۲-سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	۳-اجماع صحابہؓ
۴-اجماع اہل مدینہ	۵-قیاس	۶-قول صحابی
۷-مصلحت مرسلہ	۸-عرف وعادت	۹-سدِ ذرائع
۱۰-استصحاب	۱۱-استحسان	

علامہ شاطبیؒ (م۷۹۰ھ) نے فقہ امام مالکؒ کے اصول کو صرف چار میں منحصر کر دیا۔ الکتاب، السنۃ، اجماع اور رائے۔ عمل اہل مدینہ اور قولِ صحابی کو انہوں نے سنت میں شمار کیا اور کہا کہ یہ سنت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ باقی دوسرے ادلہ کو رائے کے زمرے میں رکھا کیونکہ وہ رائے ہی کی مختلف صورتیں ہیں (۲)۔

کتاب اللہ کے بارے میں امام مالکؒ کا نقطہ نظر

کتاب اللہ کے بارے میں امام مالکؒ کبھی بحث وتمحیص میں نہیں پڑے۔ ان کا کہنا تھا کہ

۱۔ الاعتصام ۳۱۲/۱

۲۔ المستصفیٰ ۳۸۴/۱

Marfat.com

اگر کوئی شخص قرآن حکیم کے بارے میں کسی سے مناظرہ اور مجادلہ کرتا ہے تو وہ ایسا ہے جیسے کہ وہ اس چیز میں کمی بیشی کا ارادہ کرتا ہے جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی طرف سے نازل ہوئی۔

ان سے ایسی بھی کوئی روایت نہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ انہوں نے اس بارے میں کوئی رائے دی ہو کہ قرآن لفظ اور معنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے یا صرف معنی کا۔ ان کا مسلک جمہور علماء کے مطابق یہی تھا کہ قرآن لفظ اور معنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ یہ کہتے تھے کہ یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ اسی بناء پر ان کا عقیدہ تھا کہ نماز میں متنِ قرآن پڑھنا ضروری ہے، اگر کوئی قرآن کا ترجمہ پڑھے گا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کی طرح امام مالکؒ کا مسلک بھی یہی ہے کہ کتاب اللہ میں سب سے مقدم اس کے نص کو رکھا جائے گا، اس کے بعد ظاہر کو لیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام مالکؒ بھی امام ابوحنیفہؒ کی طرح نص اور ظاہر کے درمیان فرق کرتے ہیں اور نص کو ظاہر پر ترجیح دیتے ہیں[1]۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۷۶۲ء) کا کہنا ہے کہ امام مالکؒ کی فقہ کی بناء کتاب اللہ کے بعد سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے۔ حدیث خواہ مسند ہو یا مرسل۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کے قضایا (فیصلوں) پر، اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے عمل اور ان کے فتاویٰ پر، اس کے بعد دوسرے صحابہؓ اور فقہائے مدینہ پر"[2]۔

سنّت کے بارے میں امام مالکؒ کا نقطہ نظر

سنّت کے بارے میں امام مالکؒ کا موقف یہ ہے کہ وہ امکانی حد تک اسے قیاس پر ترجیح دیتے ہیں۔ سنّت سے اخذِ احکام کے جب تمام دروازے بند ہو جائیں پھر وہ رائے اور اجتہاد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ احادیث میں اگر انہیں حدیث مرسل یا حدیث موقوف بھی مل جائے تو وہ اس

۱۔ المسوّیٰ شرح موطا (مقدمہ)

۲۔ حوالہ بالا

پر اپنے مسلک کی بناء قائم کر لیتے ہیں، اجتہاد نہیں کرتے، حتی کہ اگر انہیں کسی صحابی کا کوئی قول، فتویٰ یا فیصلہ مل جائے تو وہ اسے بھی قبول کر لیتے ہیں اور قیاس سے گریز کرتے ہیں۔

مرسل اور موقوف حدیث پر عمل کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ جمہور علماء اور فقہاء اور بطور خاص امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور ان دونوں کے تلامذہ اور اکثر تبع تابعین ان پر عمل کرنے کو صحیح جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک حضرت عمر فاروقؓ، دوسرے اکابر صحابہؓ اور اہل مدینہ میں سے تابعین کی جماعت سے استدلال کرنا درست ہے۔

امام مالکؒ اسی مسلک پر قائم اور عامل ہیں۔ ان کے نزدیک کسی حدیث کا مرسل یا موقوف ہونا اس کی صحت کے منافی نہیں۔ اس اعتبار سے امام ابوحنیفہؒ ان کے اصحاب، تبع تابعین اور خود امام مالکؒ کے نزدیک الموطا ساری صحیح ہے اور مرسل و موقوف احادیث کی شمولیت سے اس کی صحت اور درجہ استناد پر کوئی اثر نہیں پڑتا[1]۔

خبرِ واحد کے بارے میں امام مالکؒ کا رویہ یہ ہے کہ وہ اس بات کی قید لگاتے ہیں کہ وہ عملِ اہلِ مدینہ کے خلاف نہ ہو۔ اگر خبرِ واحد عملِ اہلِ مدینہ کے خلاف ہو تو وہ خبر واحد کو چھوڑ دیتے ہیں اور عملِ اہلِ مدینہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اہلِ مدینہ سنتِ نبوی کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ ان کا عمل اگر خبرِ واحد کے خلاف ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حدیث منسوخ ہو چکی ہے، ورنہ اہلِ مدینہ کا عمل اس کے خلاف نہ ہوتا بلکہ اس کے مطابق ہوتا۔ نیز امام مالکؒ اہلِ مدینہ کے عمل کو اس درجہ میں مانتے ہیں جیسے ایک جماعت دوسری جماعت سے روایت کر رہی ہو۔ ایک جماعت کی دوسری جماعت سے روایت یقیناً خبرِ واحد سے زیادہ قوی ہے اور اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ اسے خبرِ واحد پر مقدم رکھا جائے اور حکم کی بنیاد بنایا جائے۔

ابن رشدؒ (م ۵۹۵ھ) کہتے ہیں کہ امام مالکؒ نے بعض اخبارِ آحاد کو صرف اس بنیاد پر رد کر دیا کہ وہ عمل اہل مدینہ کے خلاف تھیں یا یوں کہیے کہ عمل اہل مدینہ ان کے خلاف تھا[2]۔

۱۔ بداية المجتهد ۱/۱۶۸

۲۔ اعلام الموقعين ۳/۸۳

Marfat.com

اہل مدینہ کے بارے میں امام مالکؒ کا موقف

امام مالکؒ اہل مدینہ کے عمل اور فقہائے مدینہ کے اجماع ہی کو حجت سمجھتے تھے، جبکہ دوسرے تمام فقہاء ان کی اس رائے سے متفق نہ تھے۔ اس سلسلے میں امام لیث بن سعدؒ (م ۱۷۵ھ) نے انہیں جو مفصل خط لکھا وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ خط اس خط کے جواب میں ہے جو ابتداً ان کو امام مالکؒ نے لکھا تھا۔ اس کے حوالے ملتے ہیں، پورا متن دستیاب نہیں۔ امام لیث بن سعدؒ کے خط کا متن حافظ ابن قیمؒ (م ۷۵۱ھ) نے علام الموقعین میں نقل کیا ہے۔

امام لیث بن سعدؒ لکھتے ہیں:

''آپ کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ میں یہاں ایسے فتاویٰ دیتا ہوں جو آپ کے یہاں کی عام جماعت کے خلاف ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے آپ نے اللہ سے ڈرنے کی تلقین کی ہے۔ آپ کی تحریر نے مجھ پر وہی اثر کیا جس کی آپ کو امید تھی۔ میرے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو شاذ اور منفرد فتاویٰ کو مجھ سے زیادہ مکروہ سمجھتا ہو، علمائے مدینہ کی مجھ سے زیادہ عزت وتوقیر کرتا ہو اور مجھ سے زیادہ ان کے متفق علیہ کو قبول کرنے والا ہو۔ **والحمد للّٰہ رب العالمین الذی لا شریک لہ**۔ آپ نے جو یہ لکھا کہ نبی علیہ السلام نے مدینہ میں قیام فرمایا، صحابہؓ کے سامنے وہاں آپ پر قرآن نازل ہوا، آپ نے انہیں قرآن کی تعلیم دی اور اس کی تشریح وتوضیح کی تو واقعی ایسا ہی ہے۔ لیکن آپ نے جو قرآن حکیم کی اس آیت سے استدلال کیا ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ، وَاَعَدَّلَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَداً ذٰلِكَ الْفَوْزُالْعَظِيْمُ [التوبة ۹:۱۰۰]

جن لوگوں نے دین میں پہل کی، مہاجرین اور انصار میں سے اور
پھر جنہوں نے نیکوکاری کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ نے ان کے
لیے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں،
وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

ان سابقین اوّلین میں بہت سے لوگ اللہ کی رضا کی تلاش میں جہاد کے لیے نکلے، انہوں نے بستیاں بسائیں، چھاونیاں قائم کیں، دوسرے علاقے کے لوگوں سے ان کا ربط وضبط ہوا، انہوں نے اللہ کی کتاب اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی انہیں تعلیم دی۔ جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا، وہ انہیں سکھایا۔ ہر بستی اور ہر چھاونی میں ایک ایسی جماعت قائم ہوگئی جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہترین معلّم تھی۔ جن مسائل اور حوادث کا حکم قرآن اور سنت میں نہ تھا، اس میں وہ اپنی رائے سے اجتہاد کرتے تھے، جس کی ابتداء خلفائے راشدین نے کی تھی۔ ان کی آراء اور اجتہادات کے خلاف ہمیں جب تک کوئی حکم نہ ملے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان پر عمل نہ کریں اور اپنے آپ کو ایک شہر کے علماء تک محدود کرلیں۔''

عمل اہل مدینہ سے کیا مراد ہے اور اس بارے میں امام مالکؒ کا اپنا موقف کیا ہے، وہ اہل مدینہ سے کس طبقہ کو مراد لیتے ہیں؟ اس میں ان کی دو رائیں منقول ہیں، ایک تو یہ کہ عمل اہلِ مدینہ سے فقہائے مدینہ کا عمل مراد ہے لیکن راجح اور مشہور رائے یہ ہے کہ اس میں فقہاء اور غیر فقہاء کی قید نہیں۔ جس بات پر بھی مدینہ کے لوگ جمع ہو جائیں وہ حجت ہے[1]۔

اِجماع کے بارے میں امام مالکؒ کا موقف

اجماع کے بارے میں بھی امام مالکؒ نے عمل اہلِ مدینہ کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ کے نزدیک صرف اہل مدینہ کا اجماع حجت ہے، وہ

۱۔ المستصفیٰ ۱/۱۸۷

Marfat.com

اہل مدینہ کے علاوہ کسی اور عالم اور فقیہ کو اس میں شامل نہیں کرتے۔ اپنی کتاب الموطأ میں مختلف مواقع پر جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک متفق علیہ امر یہ ہے، تو اس سے اہل مدینہ کا اجماع مراد ہوتا ہے (۱)۔

یہ بات بھی کہی گئی کہ هذا هو الامر المجتمع عليه عندنا سے مراد یہ ہے کہ کسی امر پر اہلِ علم اور اہلِ فقہ اس طرح متحد و متفق ہو گئے ہوں کہ کوئی اختلاف کرنے والا نہ ہو (۲)۔

جس امر پر اہل مدینہ کا اجماع ہو، اسے امام مالکؒ بلا شک وشبہ حجت لازمہ سمجھتے ہیں، نیز عمل اہل مدینہ سے استدلال کرتے ہیں، لیکن ان صورتوں کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہے کہ خود اہل مدینہ کے عمل میں اختلاف ہو، مدینہ میں مقیم صحابہؓ، تابعین اور اہلِ علم کی آراء کسی معاملے میں مختلف ہوں تو ان کا موقف یہ ہے کہ وہ ان آراء سے باہر نہیں جاتے، انہی میں سے کسی ایک رائے کو ترجیح دے لیتے ہیں اور اس رائے اور عمل کو ترجیح دیتے ہیں جسے قرآن یا سنت سے نسبتاً زیادہ قریب سمجھتے ہیں (۳)۔

قیاس کے بارے میں امام مالکؒ کا موقف

امام مالکؒ پچاس سال سے زیادہ مسند درس پر فائز رہے۔ مسائل کے علم اور ان کے احکام معلوم کرنے کی خاطر دور دراز علاقوں سے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ صورت حال یہ تھی کہ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھ رہا تھا، مسائل میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ہر روز ایک نیا حادثہ اور واقعہ پیش آتا اور لوگ اس کا حکم معلوم کرنے کے لیے مضطرب اور بے چین ہوتے۔ ان حالات میں امام مالکؒ جیسے محدث اور فقیہ کے لیے ضروری تھا کہ وہ لوگوں کی رہنمائی کریں۔ امورِ دین میں بھرپور رہنمائی اس وقت تک ممکن نہ تھی جب تک قرآن وسنت کے نصوص پر وسیع نظر نہ ہو۔ ان کے قریب و بعید مقاصد کا علم ہو، مقاصد شریعت سے آگاہی ہو اور اقوالِ صحابہؓ پر گہری نظر ہو۔ امام مالکؒ

۱۔ ترتیب المدارک ۱/۳۴

۲۔ مناہج الاجتہاد ص ۶۳۵

۳۔ حوالہ بالا ص ۶۳۷

Marfat.com

ان سب امور کے جامع تھے۔ نو بہ نو مسائل نے ایک فقیہ کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ عام لوگوں کو ان مسائل کے احکام سے بھی آگاہ کریں جن کا ذکر نہ نصوص میں ہے اور نہ صحابہؓ کے اقوال، فتاوی اور قضایا نے ان کی نشان دہی کی ہے۔ غیر منصوص احکام معلوم کرنے کے لیے قیاس کو اختیار کرنا پڑا۔

امام مالکؒ جب کسی مسئلے میں نہ کتاب وسنت سے کوئی نص پاتے، نہ اس بارے میں اجماع ہوتا، نہ کسی صحابی یا تابعی کا کوئی قول یا فتویٰ ملتا تو پھر وہ اپنی رائے سے اجتہاد کرتے تھے۔ امام مالکؒ نے اجتہاد بالرائے کے متعدد طریقوں کو اپنایا تھا، ان میں وہ قیاس کو کثرت سے استعمال کرتے تھے، حتی کہ انہوں نے بعض ایسے مسائل میں بھی قیاس کیا جن میں اہل مدینہ کا اجماع تھا یا صحابہؓ کے فتاویٰ منقول تھے۔ وہ قیاس میں اس حد تک توسیع کے قائل تھے کہ صرف نصوص سے ثابت شدہ احکام ہی پر قیاس نہیں کرتے تھے بلکہ ان احکام پر بھی قیاس کرتے تھے جو اولاً قیاس کے ذریعے مستنبط ہوتے تھے۔ وہ فروع میں کسی ایک فرع میں قیاس کرتے ہیں اور جب اس میں قیاس مکمل ہو جاتا ہے تو پھر علت کے اشتراک اور مشابہت کی بناء پر دوسری فرع میں بھی قیاس کرتے ہیں۔

قیاس کا دائرہ امام مالکؒ نے یہاں تک وسیع کیا کہ حدود وکفارات میں بھی قیاس کے قائل ہوئے بشرطیکہ اس کے معنی اور علت سمجھ میں آتے ہوں، حالانکہ فقہائے احناف، جن کی فقہ، فقہ الرائے کہلاتی ہے، حدود وکفارات میں قیاس سے گریز کرتے ہیں، خواہ ان کے معانی اور اسباب و علل سمجھ میں آتے ہوں یا نہ آتے ہوں (۱)۔

استحسان کے بارے میں امام مالک نے فرمایا کہ علم کے دس حصوں میں سے نو حصے استحسان ہے (۲)۔

مصالح مرسلہ کے بارے میں امام مالکؒ کا موقف

مصلحت مرسلہ بھی امام مالکؒ کے نزدیک مصادر شریعت میں سے ایک مصدر ہے۔ امام مالکؒ اس کے ماننے والوں اور اس کے ذریعے پیش آمدہ مسائل کا حل معلوم کرنے میں سرفہرست

۱۔ الموافقات فی اصول الشریعة ۱۸/۴

۲۔ المدخل للفقه الاسلامی ص ۱۰۳

Marfat.com

ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شریعتِ اسلامیہ سراسر مصلحت ہے۔ اگر اس میں لوگوں کی مصلحتوں اور منفعتوں کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو اس کا بنیادی مقصد فوت ہو جائے گا۔ امام مالکؒ اگرچہ مصالح مرسلہ کو کثرت سے استعمال کرتے ہیں لیکن بے قید طریقے سے نہیں، کچھ قیدیں اور شرطیں لگاتے ہیں تا کہ ان کے سبب وہ درجہ استناد حاصل کر سکیں اور ان پر اعتماد کیا جا سکے۔ مثلاً:

۱- ملائمت یعنی مصلحت شارع کے مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ کسی اصول کے مخالف نہ ہو اور اس کے احکام کے مآخذ میں سے کسی مأخذ کے منافی نہ ہو۔ بلکہ یہ مصالح کی اس جنس سے ہو جس کا حصول شارع کا مقصود ہے یا کم از کم اس کے قریب تر ہو۔ بالکل نامانوس، نادر اور بہت بعید نہ ہو۔

۲- اپنی ذات سے بھی قابل فہم ہو، اس طرح کہ اگر عقل سلیم کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ اسے قبول کر لے۔

۳- اس پر عمل کرنا انتہائی ضروری تحفظ کے لیے ہو یا تنگی دور کرنے کے لیے۔

ان شرائط کے ساتھ اس میں اس شرط کا اضافہ بھی ضروری ہے کہ جس مصلحت پر حکم کی بنیاد رکھی جا رہی ہے وہ حقیقی مصلحت ہو اور عامہ مسلمین کی ہو، خاص فرد یا خاص افراد کی مصلحت نہ ہو۔ اس سے کسی خاص فرد یا مخصوص افراد کا فائدہ مقصود نہ ہو[1]۔

عرف و عادت کے بارے میں امام مالکؒ کا موقف

امام مالکؒ نے استصحاب اور عرف کو بھی تسلیم کیا ہے۔ عرف کے بارے میں ان کا موقف یہ ہے کہ وہ نصِ قطعی کے نہ ہونے کی صورت میں اس کا اعتبار کرتے ہیں۔ اسی کے ذریعے وہ عام کی تخصیص اور مطلق کی تقیید کو جائز سمجھتے ہیں۔ جن احکام کا مواد معاشرہ کے عرف و عادت پر ہے وہ عرف و عادت کے تغیر سے بدل جاتے ہیں، جیسا کہ فقہائے احناف کا مسلک ہے۔

امام مالکؒ کے اصولِ اجتہاد اور اسلوبِ اجتہاد کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ فقہِ شافعی اور فقہِ حنبلی کے بالمقابل اس میں اجتہاد بالرائے کا میدان زیادہ وسیع ہے۔ اسی کے باوجود

۱۔ مناهج الاجتهاد ص ۲۳۶

Marfat.com

ان کی خوبی یہ ہے کہ سنت اور اس کے مختلف طریقوں کے تمسک اور استدلال میں بھی ان کے قدم بہت مضبوط ہیں۔

امام مالکؒ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو تعصب سے دور رکھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ ''اس بات پر نظر رکھو کہ اس دین کا منشاء کیا ہے اور ہم اسے کس طرح پورا کر سکتے ہیں۔ میں ایک انسان ہوں، مجھ سے ہر لحظہ غلطی کا امکان ہے، میری رائے اور اجتہاد میں کوئی بات قرآن اور سنت کے خلاف دیکھو تو اسے چھوڑ دو''(۱)۔

مالکی مسلک کی ترویج واشاعت، حلقۂ اثر

مدینہ نزولِ وحی الٰہی کا مقام اور اہلِ سنت کا گہوارہ تھا۔ وہاں ایک قسم کا مدرسہ (School of thought) قائم ہوا جو مدرسہ اہل حجاز یا مدرسہ اہل مدینہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی بنیاد حضرت عمرؓ کے بیٹے حضرت عبداللہ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کے دور میں پڑی۔ صحابہؓ کے بعد اس مدرسہ میں جو محدث اور فقیہ ان کے جانشین ہوئے ان میں سعید بن مسیبؒ (م ۹۱ھ)، عروہ بن الزبیرؒ (م ۹۴ھ) قاسم بن محمدؒ (م ۱۰۱ھ)، ابوبکر بن عبدالرحمانؒ (م ۹۴ھ) سلیمان بن یسارؒ (م ۱۰۷ھ) اور خارجہ بن زیدؒ (م ۱۰۰ھ) نمایاں ہیں(۲)۔

اس طبقہ فقہاء کے بعد مدینہ منورہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے تشریف لائے تھے اور جسے آپ کے دارالہجرت ہونے کا شرف حاصل تھا، حدیث کی مرکزی درس گاہ بن گیا۔ یہیں سے امام مالکؒ کے فقہی مسلک کی ابتداء ہوئی۔ اوّلاً آپ کا مسلک حجاز میں پھیلا۔ ایسا ہونا ایک طبعی امر تھا کیونکہ مدینہ ہی میں آپ نے درس وتدریس کی ابتداء کی اور اسی کو فقہ واجتہاد کا مرکز بنایا۔ پوری زندگی مدینہ میں گزاری اور حج کے علاوہ کبھی مدینہ سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اس لیے ان کی فقہ کی ترویج واشاعت سب سے پہلے مدینہ میں ہوئی اور آہستہ آہستہ ان کا فقہی مسلک پورے

۱۔ المدخل للفقه الاسلامی ص ۱۰۳

۲۔ الانتقاء ص ۱۲

Marfat.com

حجاز میں پھیل گیا[1]۔

اس کی ایک بنیادی وجہ تو ان کی مجلسِ درس ہے۔ مسجد نبوی میں ان کے درسِ حدیث کو جو قبولِ عام حاصل ہوا وہ اس دور میں کسی بھی محدّث کا حصہ نہ بن سکا۔ پھر یہ مجلس درس اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ نصف صدی سے بھی کچھ زیادہ عرصے تک قائم رہی اور قریب و بعید کے بے شمار لوگوں نے آپ کی مجلس درس حدیث سے استفادہ کیا۔

دوسری بنیادی وجہ ان کی مشہور تالیف الموطأ ہے جو مدینہ ہی میں مرتب و مدوّن ہوئی اور جس کا دور تدوین ۱۳۰ھ-۱۴۰ھ کا درمیانی عرصہ ہے۔ الموطأ مالکی فقہ کی نہ صرف یہ کہ نخستِ اوّل ہے بلکہ فقہ مالکی میں اس کی حیثیت مرکزی بھی ہے۔ امام مالکؒ کے اجتہادات الموطأ ہی کے ذریعے اہل علم تک پہنچے۔ کم و بیش یہی دور فقہ حنفی کی تدوین کا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ ۱۴۴ھ میں تدوین فقہ سے فارغ ہوئے لیکن انہوں نے تدوین فقہ کا تمام کام کوفہ میں کیا۔ اس لیے ابتدائی مرحلے میں فقہ مالکی اور فقہ حنفی میں ٹکراؤ کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی[2]۔

امام مالکؒ کے تلامذہ اور ان سے براہ راست علم حاصل کرنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے اور وسعت کے ساتھ ساتھ اس میں تنوع بھی ہے۔ اس حلقے پر نظر ڈالنے سے حیرت ہوتی ہے کہ مختلف سمت و جہت، مختلف علوم کے ماہر اور مختلف ذوق کے ماہر ایک ہی مرکز کے گرد کس طرح جمع ہو گئے تھے۔ امام مالکؒ سے استفادہ کرنے والوں میں مفسّر، محدّث، فقیہ، مجتہد، فلسفی حتیٰ کہ حکّام اور سلاطین تک شامل ہیں۔

امام مالکؒ کا فقہی مسلک سب سے پہلے حجاز میں پھیلا لیکن اس کے باوجود اسے اپنی ابتداء اور نشو ونما کے مرکز میں ثبات و دوام حاصل نہ ہو سکا۔ اس صورت حال کو قاضی عیاضؒ (م ۵۴۴ھ) اس طرح بیان کرتے ہیں:

''یہ عظیم الشان فقہی مسلک حجاز کے شہروں میں پھیلا اور پورے علاقے میں چھا

۱۔ مالک، حیاتہ و عصرہ، آراوہ و فقہ ص ۴۴۴ ومابعد

۲۔ الامامۃ والسیاسۃ ۱۵۵/۲

Marfat.com

گیا۔ دوسرے آئمہ اور فقہاء کی آراء کو اس نے مغلوب کر دیا اور ایسا ہونا ایک طبعی امر تھا۔ اس لیے کہ یہ مسلک حجاز ہی میں پیدا ہوا اور یہیں پروان چڑھا اور بطور خاص فقہائے مدینہ کی آراء اور ان کے اجماع کو اس میں بنیادی حیثیت دی گئی اور انہی کے طریقہ پر اس میں استنباط کیا گیا۔ لیکن حالات کی تبدیلی اور تغیر نے اس صورت حال کو متاثر کیا۔ اس مسلک کے لیے کئی دور اضمحلال کے آئے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے کہا کہ ایک زمانہ ایسا آیا کہ مدینہ میں بھی مالکی مسلک کا کوئی فقیہ اور مجتہد باقی نہ رہا[1]۔

مدینہ میں امام مالکؒ کے سب سے بڑے شاگرد عبدالملک بن عبدالعزیز بن عبداللہ بن ابی سلمہ الماجشونؒ (م ۲۱۲ھ) ہیں۔ علامہ ابن ماجشونؒ فقیہ و فصیح تھے۔ ان سے پہلے مدینہ میں فتوے کا دارومدار ان کے والد پر تھا۔ ان کی وفات کے بعد علامہ ابن ماجشونؒ پر رہا۔ اپنے دور میں اہلِ مدینہ کے مفتی رہے۔ امام مالکؒ کے بہت سے تلامذہ نے ان سے استفادہ کیا۔ علامہ سحنونؒ (م ۲۴۰ھ) ان کے بڑے مداح تھے۔ علامہ ابن ماجشونؒ مدینہ میں فقہ مالکی کی پذیرائی کا ایک موثر ذریعہ بنے۔

حجاز کے بعد فقہ امام مالکؒ کی ترویج و اشاعت مصر میں ہوئی۔ مصر میں اس فقہ کے تعارف کا اوّلین ذریعہ کون بنا؟ اس میں آراء اور اقوال مختلف ہیں۔ بعض مورخین نے کہا کہ مصر میں مالکی فقہ کے اوّلین تعارف کا ذریعہ ان کے شاگرد عبدالرحمان بن قاسم (م ۱۹۱ھ) بنے۔ یہ الموطا کے راویوں میں ہیں۔ الموطا کا ایک نسخہ انہی کا روایت کردہ ہے۔ مصر میں ان کی بہت قدر و منزلت تھی۔ خود امام مالکؒ ان کے تقوی اور علم و فضل کے قدردان تھے۔ ایک روز ان کی مجلس میں علامہ ابن قاسمؒ کا ذکر ہوا اور ان کے بعض ساتھیوں نے ان کے بارے کہا کہ ابن قاسمؒ تو مشک سے بھری ہوئی تھیلی ہے[2]۔

ابن فرحونؒ (م ۷۹۹ھ) کا دعویٰ ہے کہ امام مالکؒ کی فقہ اور ان کے علوم کو جس شخص نے

۱۔ مالک حیاته و عصره ص ۳۸۲

۲۔ کشف الظنون ۲۰۳۲/۲

سب سے پہلے مصر میں متعارف کرایا، وہ عثمان بن حکم جذامیؒ (م ۱۶۳ھ) ہیں (۱)۔

حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۶ھ) کا کہنا ہے کہ امام مالکؒ کے فقہی مسائل اور ان کی کتاب الموطا کو مصر میں لانے والے اوّلین اشخاص عبدالرحیم بن خالد بن یزیدؒ اور عثمان بن حکم ہیںؒ (۲)۔

مصر میں مالکی فقہ وعلوم کا ذریعہ عبدالرحمان بن قاسمؒ بنے ہوں یا عثمان بن حکمؒ، اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ دونوں امام مالکؒ کے براہ راست تلامذہ میں شامل ہیں۔ دونوں کم وبیش چند سال کے فرق سے ایک ہی زمانے میں مصر آئے اور وہاں آ کر تعلیم وتدریس میں مصروف ہو گئے۔ مالکی علوم پہلے ان کے ذریعے مصر میں پھیلے اور پھر ان کے شاگردوں نے بھی یہاں فقہ مالکی کی ترویج و اشاعت میں بھرپور حصہ لیا۔ امام مالکؒ کے تین دوسرے شاگرد عبداللہ بن وہبؒ (م ۱۹۷ھ)، یحییٰ بن بکیرؒ (م ۲۳۱ھ) اور سعید بن عفیرؒ (م ۲۲۶ھ) بھی مصر میں ان کے علوم کے مخلص اور مؤثر ترجمان ومبلغ ثابت ہوئے۔ یہ تینوں حضرات بھی الموطا کے روایت کرنے والوں میں شامل ہیں۔

ابن وہبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''اگر مجھے امام مالکؒ کی صحبت حاصل نہ ہوتی تو میں گمراہ ہو جاتا'' (۳)۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ امام مالکؒ کے تمام شاگردوں میں سنن اور آثار کا سب سے زیادہ علم رکھنے والے تھے۔

یحییٰ بن بکیرؒ نے الموطا امام مالکؒ سے چودہ مرتبہ پڑھنے کی سعادت حاصل کی، الموطا میں جو چالیس حدیثیں ثنائی ہیں، انہیں یحییٰ بن بکیرؒ نے ایک رسالہ میں جمع کیا ہے۔ اس رسالہ نے مغرب میں اتنی شہرت ومقبولیت حاصل کی کہ علمائے اندلس جب اپنے شاگردوں کو فراغت کی سند دیتے تھے تو اس رسالہ کو تبرکاً پڑھاتے تھے۔ امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) اپنی الجامع الصحیح میں ان سے بلاواسطہ روایت کرتے ہیں (۴)۔

سعید بن عفیرؒ کا شمار مشاہیر مصر میں ہوتا ہے۔ الموطا کے راویوں میں ہیں۔ امام بخاریؒ

۱۔ کشف الظنون ۲۰۳۲/۲
۲۔ حوالہ بالا
۳۔ الانتقاء ص ۴۸
۴۔ بستان المحدثین (اردو) ص ۳۱

Marfat.com

نے ان سے روایت کی ہے۔ علم حدیث کے علاوہ تاریخ، سیرت، ادب اور علم الانساب میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔

المدونة الکبریٰ کے نام سے امام مالکؒ کی آراء اور فتاویٰ پر مشتمل جو پہلا مجموعہ مرتب ہوا، اس کا مقام ترتیب وتدوین مصر ہی ہے۔ ابن قاسمؒ جو مصر میں فقہ امام مالکؒ کے پہلے سفیر ہیں، اس مجموعے کے مرتب ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حجاز کے علاوہ مصر میں بھی امام مالکؒ کی فقہ ان کی اپنی زندگی ہی میں رائج ہوگئی تھی۔ مشہور مورخ ابن خلدونؒ (م ۸۰۸ھ) نے مغرب میں مالکی مسلک کی ترویج واشاعت پر بڑا جامع تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''امام مالکؒ کا فقہی مسلک مغرب اور اندلس میں پھیلا۔ ان علاقوں کے علاوہ دوسرے علاقوں میں بھی مالکی مسلک کی ترویج واشاعت ہوئی۔ ان کی کتابوں اور شاگردوں کے ذریعے بیشتر اسلامی ملکوں میں فقہ مالکی کا تعارف ہوا، اگرچہ وہ بہت محدود تھا۔ اس صورت حال کی وجہ یہ ہوئی کہ اندلس اور مغرب کے لوگ عام طور پر سیدھے حجاز جاتے تھے اور وہیں ان کا سفر ختم ہو جاتا تھا۔ مدینہ ان دنوں علم کا مرکز تھا، ہر علاقے کے طالبانِ علوم اسی سرچشمہء علم سے اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ اس لیے اندلس کے لوگوں نے علم ومعرفت کی جو بھی خوشہ چینی کی وہ حجاز اور پھر اس میں بھی بطور خاص مدینہ سے کی، عراق یا کسی اور خطے سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ امام مالکؒ ہی ان کے شیخ الکل اور امام مجتہد تھے۔ اندلس اور مغرب کے لوگوں نے امام مالکؒ سے استفادہ کیا، پھر ان کی وفات کے بعد ان کے تلامذہ سے کسب فیض کیا اور انہی کو اپنا علمی اور دینی پیشوا بنایا۔ اندلس اور مغرب میں مالکی مسلک کی ترویج واشاعت اور قبول عام کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہوئی کہ اس علاقے کے لوگ سیدھے سادے اور دیہاتی طرز بود و باش کے عادی تھے۔ وہ عراق کے مہذب اور پرتکلف معاشرے سے کوسوں دور تھے۔ حجاز میں بھی یہی صورت حال تھی، وہاں بھی لوگ سادہ زندگی

Marfat.com

گزارتے تھے اور تکلفات سے مانوس نہ تھے۔ اس طرح اہل مغرب و اندلس اور اہل حجاز میں دینی اتحاد و اتفاق اور ذہنی و فکری ہم آہنگی ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مالکی مسلک بعد کے ادوار میں تہذیبی رنگ و بو سے دور ہی رہا اور اس نے اپنی سادگی کی قدیم روایت کو برقرار رکھا''(۱)۔

پانچوں صدی ہجری میں جب مغرب میں بنی تاشفین کی حکومت قائم ہوئی، مالکی فقہ کا اثر و نفوذ اس علاقے میں اور مضبوط ہوگیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بنی تاشفین کے امراء اور حکام دین دار اور سادہ طرزِ بود و باش کے حامل تھے اور تکلف اور تصنع سے پرہیز کرتے تھے۔

اس دور میں فقہ امام مالکؒ کا اس حد تک غلبہ ہوا کہ تمام قاضیوں کو اس بات کا پابند کر دیا گیا کہ وہ کسی مفتی اور فقیہ سے فتویٰ لیے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں۔ حکومت کے اس حکم اور فیصلے سے مالکی فقہ کی امامت و سیادت میں مزید اضافہ ہوا۔ یہ کہنا مبالغے سے خالی ہوگا کہ باقی آئمہ ثلاثہ کے فقہی مسلک میں سے کوئی بھی مسلک آج تک اندلس اور مغرب میں فقہ امام مالکؒ پر غالب نہیں آسکا(۲)۔

بعد کے ادوار میں جو اہل علم و فضل مالکی فقہ کے ترجمان بنے اور انہوں نے اپنی گراں قدر تالیفات کے ذریعے اسے زندہ رکھا، ان میں نمایاں نام یہ ہیں: عبدالسلام بن سعید تنوخی ملقب بہ سحنونؒ (م ۲۴۰ھ) مولف المدونة الكبرىٰ ابوبکر محمد بن عبداللہ معروف بہ ابن العربیؒ (م ۵۴۳ھ) مولف احکام القرآن ابوالولید محمد احمد بن رشد (م ۵۹۵ھ) مولف بداية المجتهد و نهاية المقتصد)۔

[ڈاکٹر محمد میاں صدیقی]

مصادر و مراجع

۱۔ آمدی، ابوالحسن سیف الدین علی بن محمد (م ۶۳۱ھ)، الإحكام في اصول الأحكام، مطبعة المعارف، القاهرة ۱۹۱۴ء

۱۔ مقدمہ ابن خلدون ص ۳۹۲

۲۔ الانتقاء ص ۱۰، ۴۱

Marfat.com

۲۔ ابن خلدون، عبدالرحمٰن (م۸۰۸ھ)، مقدمة ابن خلدون، مطبعة مصطفی محمد، القاهرة

۳۔ ابن رشد، ابوالولید محمد بن احمد (م۵۹۵ھ)، بداية المجتهد و نهاية المقتصد، طبع مصر ۱۹۶۹ء

۴۔ ابن عبدالبر ابوعمر یوسف بن عبداللہ (م۱۸۲ھ)، جامع بيان العلم، ادارة الطباعة المنيرية، مصر

۵۔ ابن عبدالبر، الانتقاء، مكتبة قدسی، مصر ۱۳۵۰ھ

۶۔ ابن قتیبہ دینوری، عبداللہ بن مسلم (م۲۷۶ھ)، الامامة والسياسة، المكتبة التجارية، مصر ۱۳۴۷ھ

۷۔ ابن قیم جوزیہ، محمد بن ابی بکر (م۷۵۱ھ)، اعلام الموقعين، طبع مكتبة الكليات، القاهرة ۱۹۶۸ھ

۸۔ بزدوی، ابوالحسن علی بن محمد بن حسین (م۴۸۲ھ)، اصول البزدوی، طبع قسطنطنية ترکی ۱۳۰۷ھ

۹۔ حاجی خلیفہ، مصطفیٰ بن عبداللہ (م۱۰۶۷ھ)، كشف الظنون، طبع استنبول

۱۰۔ ذہبی، شمس الدین محمد عثمان (م۷۴۸ھ)، تذكرة الحفاظ، طبع حیدرآباد دکن، بھارت ۱۹۵۵ء

۱۱۔ سیوطی، جلال الدین (م۹۱۱ھ)، تنوير الحوالک شرح موطا امام مالک، داراحياء الكتب العربية، القاهرة

۱۲۔ شاطبی، ابواسحاق ابراہیم بن موسیٰ (م۷۹۰ھ)، الاعتصام، مطبع المنار، مصر ۱۹۱۳ء

۱۳۔ شاطبی، الموافقات فی اصول الشريعة، دارالمعرفة، بيروت

۱۴۔ شاہ ولی اللہ دہلوی (م۱۷۶۲ء)، المسویٰ شرح موطا (المقدمة)

۱۵۔ شعرانی، عبدالوہاب (م۹۷۳ھ)، الميزان الكبرى، طبع القاهرة مصر ۱۹۷۹ء

Marfat.com

۱۶۔ علی حسن عبدالقادر، نظرة عامة فی الفقه الاسلامی، طبع القاهرة ۱۹۴۲ء

۱۷۔ عیاض بن موسیٰ، قاضی (م ۵۴۴ھ)، ترتیب المدارک، طبع ۱۹۶۵ء

۱۸۔ غزالی، محمد بن محمد (م ۵۰۵ھ)، المستصفیٰ فی اصول الفقه، طبع القاهرة ۱۹۳۷ء

۱۹۔ محمد ابوزہرہ، مالک حیاته و عصره۔ آراؤه و فقهه، دارالفکر العربی، القاهرة

۲۰۔ محمد سلام مدکور، مناهج الاجتهاد، طبع دارالنهضة العربیة، القاهرة مصر ۱۹۶۰ء

۲۱۔ محمد سلام مدکور، المدخل للفقه الاسلامی

۲۲۔ موسیٰ، محمد یوسف، الفقه الاسلامی، طبع دارالکتب العربی، مصر ۱۹۵۸ء

Marfat.com

فصل سوم

فقہ شافعی اور اس کے اصولِ اجتہاد

فقہ شافعی کے بانی امام شافعیؒ

فقہ شافعی کے بانی امام محمد بن ادریس الشافعیؒ ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کی وفات رجب ۱۵۰ھ میں ہوئی اور اسی ماہ و سن میں امام شافعیؒ پیدا ہوئے۔ بلکہ بعض تذکرہ نگاروں نے یہاں تک کہا ہے کہ جس روز امام ابوحنیفہؒ کی وفات ہوئی، وہی امام شافعیؒ کا یومِ ولادت ہے (۱)۔

جس طرح امام ابوحنیفہؒ کو چاروں ائمہ مجتہدین میں تابعی ہونے کا شرف حاصل ہے اسی طرح امام شافعیؒ کو ہاشمی النسب ہونے کی فضیلت حاصل ہے۔ عبد مناف پر جا کر آپ کا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ شافع آپ کے جدِ اعلیٰ تھے، شافعی انہی کی طرف نسبت ہے۔ والد ادریس تبالہ کے رہنے والے تھے جو حجاز میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ انہوں نے اوائل عمر ہی میں تبالہ چھوڑ کر مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

امام شافعیؒ کی پیدائش سے چند روز ہی پہلے ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت امام کی والدہ غزہ نامی ایک آبادی میں مقیم تھیں جو مصر میں عسقلان کے مضافات میں ہے (۲)۔

نشو و نما - ابتدائی تعلیم و تربیت

امام شافعیؒ دو برس کے تھے کہ ان کی والدہ انہیں عسقلان سے حجاز لے گئیں۔ سات برس کی

۱۔ توالی التاسیس ص ۵۲
۲۔ حوالہ بالا ص ۵۳

Marfat.com

عمر میں قرآن کریم حفظ کرلیا تھا۔ دس برس عمر ہوئی تو آپ موطا امام مالکؒ زبانی یاد کر چکے تھے[1]۔

امام شافعیؒ نے نوجوانی میں لغت اور شعروادب میں دسترس حاصل کی۔ آپ کے بہت سے اشعار اور قصائد تذکرہ نگاروں نے نقل کیے ہیں۔ آپ نے کچھ عرصہ مکہ مکرمہ میں قیام کیا اور وہاں سفیان بن عیینہؒ (م ۱۹۸ھ) اور مسلم زنجیؒ (م ۱۸۰ھ) سے حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آپ مدینہ منورہ چلے گئے۔ وہاں امام مالکؒ سے ملاقات ہوئی اور ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ امام شافعیؒ جب پہلی بار امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے پوچھا: تمہارا نام کیا ہے؟ امام شافعیؒ نے جواب دیا: محمد۔ امام مالکؒ نے امام شافعیؒ کے سراپا پر گہری نظر ڈالی اور فرمایا: اے محمد! اللہ سے ڈرتے رہنا، ایک دن تو بڑی شان والا ہوگا۔ جب تک امام مالکؒ زندہ رہے (۱۷۹ھ تک) آپ انہی کے حلقۂ درس سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد عراق جا کر امام ابوحنیفہؒ کے شاگردِ خاص امام محمد بن حسن شیبانیؒ (م ۱۸۹ھ) سے استفادہ کیا۔ آپ مختلف علماء سے استفادے کی خاطر حجاز، یمن، عراق، اور مصر میں بارہا اقامت پذیر ہوئے[2]۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ) کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے جن شیوخ سے استفادہ کیا ان کی تعداد اسّی (۸۰) ہے۔ ان میں امام مالکؒ کے علاوہ مشہور اور قابل ذکر حضرات یہ ہیں: مسلم بن خالد زنجیؒ (م ۱۸۰ھ)، فُضَیل بن عیاضؒ (م ۱۸۷ھ)، سفیان بن عیینہؒ (م ۱۹۸ھ)، وکیع بن الجراحؒ (م ۱۹۷ھ)، یحییٰ بن سعید القطانؒ (م ۱۹۴ھ)، محمد بن حسن شیبانیؒ (م ۱۸۹ھ)، اسامہ بن زیدؒ (م ۱۶۶)، حماد بن سلمہؒ (م ۱۶۷ھ)، حماد بن اسامہ کرفیؒ (م ۲۱۱ھ) اور عبداللہ بن مبارک مَروزیؒ (م ۱۸۱ھ)[3]۔

ابتداء میں امام شافعیؒ نے امام مالکؒ کے فقہی مسلک کی پیروی کی لیکن بعد میں اپنے کثرتِ علم اور وسیع تجربے کی بناء پر ایک نئے فقہی مسلک کی بنیاد رکھی۔

۱۔ مناقب الشافعی ۳۲۹/۱

۲۔ مناهج الاجتهاد ص ۲۴۲

۳۔ الفقه الاسلامی ص ۱۳۷

Marfat.com

لغت، انساب، تفسیر، حدیث اور کلام میں آپ کی مہارت مسلمہ تھی۔ بحث و تمحیص، مناظرہ اور اجتہاد و استنباط میں خاص ملکہ رکھتے تھے۔ اللہ نے ان کو اظہارِ بیان کی زبردست قدرت عطا کی تھی۔ اِن صفات و خصوصیات نے آپ میں اہل الرائے اور اہل حدیث کے طریقوں کو متحد کرنے کی پوری صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ آپ کا فقہی مسلک حنفی اور مالکی مسلک کے درمیان ہے۔ آپ کتاب اللہ، سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اجماع اور قیاس، ان چاروں مصادر سے استنباطِ مسائل کرتے تھے اور چاروں کو قابلِ استدلال سمجھتے تھے، مگر حنفیہ کے استحسان اور مالکیہ کے مصالحِ مرسلہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے آپ کے تلامذہ کی تعداد کم و بیش ایک سو ساٹھ بتائی ہے۔ ان میں بعض اس رتبے کے ہیں جو خود مجتہد اور صاحب مسلک ہیں، جیسے امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ)، امام داؤد ظاہریؒ (م ۲۷۰ھ)، امام ابو ثور بغدادیؒ (م ۲۴۰ھ) اور امام ابن جریر طبریؒ (م ۳۱۰ھ)۔

ان کے علاوہ ابوبکر عبداللہ بن زبیر حمیدیؒ (م ۲۱۹ھ)، حرملہ بن یحییٰؒ مصری (م ۲۴۴ھ)، سلیمان بن داؤدؒ (م ۲۱۹ھ)، حسن بن محمد زعفرانی بغدادیؒ (م ۲۵۹ھ)، ابوابراہیم اسماعیل بن یحییٰ مزنیؒ (م ۲۶۴ھ)، ربیع بن سلیمانؒ (م ۲۵۶ھ) اور ابو یعقوب یوسف بن یحییٰ قریشی بویطیؒ (م ۲۳۱ھ) نے بھی علمی دنیا میں بلند مقام پیدا کیا[1]۔

ان تلامذہ کے بعد جن فقہاء نے شافعی مسلک کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ان میں زبیر بن سلیمانؒ بصری (م ۳۲۰ھ)، سہیل بن محمدؒ (م ۳۸۷ھ)، ابومحمد عبداللہ ابن یوسفؒ جوینی (م ۴۳۸ھ)، ابومنصور عبدالقاہر بن طاہر بغدادیؒ (م ۴۲۹ھ)، ابوالقاسم عبدالرحمان بن محمد نورانی مروزیؒ (م ۴۶۱ھ)، ابوالحسن علی بن محمد ابن حبیب ماوردیؒ (م ۴۵۰ھ)، ابواسحاق فیروز آبادیؒ (م ۴۷۶ھ)، عبدالکریم ابن محمد سمعانیؒ (م ۵۲۲ھ)، ابوحامد محمد غزالیؒ (م ۵۰۵ھ)، فخر الدین

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، تذکرۃ الحفاظ، تہذیب التہذیب

Marfat.com

ابن عساکر دمشقیؒ (م۶۲۰ھ)، محی الدین نوویؒ (م۶۷۶ھ)، تقی الدین ابن الصلاحؒ (م۶۴۳ھ)، تقی الدین علی سبکیؒ (م۷۵۶ھ)، ابن دقیق العیدؒ (م۷۰۲ھ)، جلال الدین سیوطیؒ (م۹۱۱ھ) اور ابن حجر مکیؒ (م۹۷۴ھ) نمایاں ہیں[1]۔

شافعی مسلک کا سب سے بڑا مرکز مصر بنا، کیونکہ امام شافعیؒ نے اپنی زندگی کے آخری ایام یہیں گزارے اور یہیں اپنے مسلک کو رواج دیا تھا۔ آپ کے اکثر تلامذہ اور مسلک کے پیروکار مصر ہی میں گزرے۔ ایک عرصہ تک جامعہ الازہر کے شیخ کا منصب بھی شافعی علماء کے لیے مخصوص رہا۔

فقہ شافعی کے اصولِ اجتہاد

زمانی ترتیب کے لحاظ سے سب سے پہلے امام ابوحنیفہؒ کا فقہی مسلک وجود میں آیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ اور اجتہاد کا عمل کم و بیش ۱۲۲ ہجری میں شروع کیا اور ۱۴۴ ہجری میں اپنے انتقال سے چھ برس پہلے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ امام مالکؒ نے ۱۳۰ ہجری کے بعد اجتہاد و استنباط احکام کا کام شروع کیا۔ گویا زمانی ترتیب میں ائمہ اربعہ میں دوسرا نمبر امام مالکؒ کا ہے۔ تیسرے امام مجتہد، امام محمد بن ادریس شافعیؒ ہیں جو ۱۵۰ ہجری میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد خاص امام محمد بن حسن شیبانیؒ کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ فقہِ امام مالکؒ اور فقہِ امام ابوحنیفہؒ سے آگاہی حاصل کی۔ اس طرح امام شافعیؒ نے اہل حدیث اور اہل رائے دونوں کے علوم کو جمع کیا اور ان کی روشنی میں ایک نئے فقہی مسلک کی بنیاد رکھی۔

امام شافعیؒ کے بارے میں اکثر اہل علم نے یہ بات کہی ہے کہ ''ان سے پہلے فقہ کے کوئی اصول وضوابط نہ تھے اور نہ صحیح و غلط مسائل معلوم کرنے کا کوئی معیار تھا، نہ احادیث مختلفہ میں تطبیق دینے اور ان کے تعارض کو دور کرنے کا کوئی قانون اور طریق کار موجود تھا۔ امام شافعیؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ان تمام امور کے لیے اصول اور قواعد وضوابط مرتب کیے اور اصولِ فقہ کے نام سے ایک نئے علم کی بنیاد رکھی''[2]۔

۱۔ وفیات الاعیان ۲/۲۶، ۵۲، ۶۹، ۱۵۲

۲۔ تاریخ بغداد ۴/۴۲۴

اہلِ علم کا یہ دعویٰ ایک حد تک بجا اور درست، مگر یہ نہیں کیا جا سکتا کہ امام شافعیؒ سے پہلے اصول اور قواعد وضوابط کا وجود ہی نہ تھا، جبکہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ شافعی سے پہلے تدوینِ فقہ اور اجتہاد واستنباط کا عمل بنیادی طور پر مکمل ہو چکا تھا۔ امام ابوحنیفہؒ (م ۱۵۰ھ)، امام ابن ابی لیلیٰؒ (م ۱۴۸ھ)، امام لیث بن سعدؒ (م ۱۷۵ھ)، امام سفیان ثوریؒ (م ۱۶۱ھ) اور امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ) امام شافعیؒ سے پہلے فقہ واجتہاد کی مسند پر فائز ہو چکے تھے۔ جن ادلہ اور مصادر سے ان حضرات نے استفادہ کیا اور استنباطِ احکام کے لیے ان کو مآخذ ومصادر بنایا، امام شافعیؒ ان میں اضافہ تو کجا ان سب سے فائدہ بھی نہ اٹھا سکے اور کئی مآخذ ومصادر سے استفادے سے انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ بات مسلّم ہے کہ ان حضرات نے نہ بے دلیل اجتہاد کیا اور نہ اصول وضوابط کے بغیر۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قیاس، مصالحِ مرسلہ اور استحسان میں بطور خاص قدیم فقہاء نے پُر مغز بحثیں کیں، ان کے اصول وقواعد بیان کیے، صحت اور انعقاد کی شرائط وضع کیں اور اس امر کا تعین کیا کہ وہ کون سا مرحلہ ہوگا جب کسی مجتہد اور فقیہ کے ہاتھ میں یہ اختیار ہوگا کہ وہ قیاس، مصلحتِ مرسلہ اور استحسان سے کام لے سکتا ہے۔

حقیقت پسندانہ بات یہ ہے کہ اس حد تک بنیادی اور اساسی قواعد موجود تھے جن کی مدد سے اجتہاد کیا جا سکتا تھا لیکن وہ مہذب ومرتب یا کتابی صورت میں نہ تھے۔ امام شافعیؒ نے ان کو مربوط و منظم کر کے کتابی شکل دی۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فقہ کے اصول وقواعد تو تھے مگر اس وقت تک فقہ کو ایک علم اور فن کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ امام شافعیؒ نے یہ کارنامہ سرانجام دیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اجتہاد واستنباط کے صرف بنیادی اور اساسی قواعد تھے، ذیلی اور تفصیلی قواعد نہ تھے، وہ امام شافعیؒ نے مرتب کیے۔ امام شافعیؒ نے انہیں ابواب وفصول میں تقسیم کیا، ان کے مراتب کا تعین کیا، قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس سے استدلال کی شرطیں مقرر کیں، ناسخ و منسوخ، مطلق ومقید اور عام وخاص کی بحثیں قائم کیں۔

امام شافعیؒ نے اپنی تصنیف الرسالۃ میں خود اس بات کا اعتراف کیا کہ انہوں نے حنفی اور

Marfat.com

مالکی مسلک کے اصول و فروع دیکھ کر اور ان کے تمام کلیات و جزئیات پر نظر کر کے از سرنو اصول و قواعد کو مرتب کیا اور ان میں جہاں کمی پائی یا اجمال دیکھا، اسے مکمل کر دیا[1]۔

امام شافعیؒ نے اپنے اصولِ اجتہاد اپنی دو مصنفات الرسالة اور الأمُّ میں بیان کیے ہیں۔ ان کی ترتیب یوں ہے:

ا۔ کتاب اللہ

امام شافعیؒ کتاب اللہ یعنی قرآن حکیم کو قطعی حجت اور تمام شرعی احکام و قوانین کا مصدر اوّل مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس وقت تک قرآن کے ظاہر پر عمل اور اس سے استدلال ضروری ہے جب تک کوئی ایسی دلیل موجود نہ ہو جس کی بنیاد پر ظاہری معنی کو چھوڑ کر اس کا کوئی دوسرا مفہوم و منطوق مراد لیا جائے۔

۲۔ سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کتاب اللہ کے بارے میں کسی مجتہد کی دو رائے نہیں ہوئیں۔ بلاشبہ کتاب اللہ اسلامی قوانین کا مصدرِ اوّل ہے۔ اسی طرح سنّت کے بارے میں بھی کوئی فقیہ و مجتہد تردد کا شکار نہیں ہوا۔ یقیناً سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلامی قوانین کے مصدر ثانی ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ البتہ اسناد کے نقطۂ نظر سے حدیث کی جو مختلف اقسام ہیں، ان کے حوالہ سے مجتہدین کی آراء اور نقطہ ہائے نظر میں جزوی اور فروعی اختلاف ہے۔

امام شافعیؒ کتاب اللہ کے بعد سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اسے مصدر تشریع قرار دیتے ہیں۔ امام شافعیؒ نے اس بات کی بار بار تصریح کی ہے کہ اگر ان کی رائے مخالفِ حدیث ہو تو یہ حدیث سے لاعلمی کی بناء پر ہو سکتا ہے، ورنہ حدیث معلوم ہو جانے کے بعد وہ ہر حال میں اس حدیث کو اپنی رائے کی بنیاد بنائیں گے۔ امام شافعیؒ نے اپنے اصحاب کو بھی یہ کہا کہ اگر وہ امام شافعیؒ کی کوئی رائے حدیث کے خلاف پائیں تو اسے ترک کر دیں اور حدیث پر عمل کریں اور حدیث کے مقابلے میں اُن کی رائے کو اہمیت نہ دیں[2]۔

ا۔ الرسالة ص ٦٨

۲۔ الامام الشافعی ص ۳۱۹

Marfat.com

حدیث کے بارے میں امام شافعیؒ کا نقطۂ نظر تفصیل اور تجزیے پر مبنی ہے۔ اس کا مجمل و مختصر خاکہ کچھ اس طرح ہے:

۱۔ حدیث کے بارے میں امام شافعیؒ کا عمل یہ ہے کہ اگر ایک ہی معاملے میں ایک سے زائد روایتیں ہیں، ایک روایت میں الفاظ کم ہیں اور دوسری روایت میں الفاظ زیادہ ہیں اور زیادہ الفاظ والی روایت کے راوی کم الفاظ والی روایت کے راویوں سے زیادہ معتبر و مستند نہیں ہیں تو وہ اس زیادتی کو قبول نہیں کرتے۔

۲۔ دو حدیثوں یا چند احادیث میں اگر باہمی تعارض ہو تو امام شافعیؒ دیکھتے ہیں کہ راوی کیسے ہیں اور کس روایت میں زیادہ محتاط اور بلند پایہ راوی ہیں۔ مثلاً مدینہ میں امام زہریؒ (م ۱۲۴ھ) کے دو مشہور شاگرد ہیں، امام مالکؒ اور امام شعیب بن ابی حمزہؒ، ایسی صورت میں وہ امام مالکؒ کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔

۳۔ دو متعارض روایتوں میں اگر تطبیق ممکن نہیں ہوگی تو جو روایت طریقۂ سند میں بلحاظ کثرت و شہرت ممتاز ہوگی، اسے قبول کیا جائے گا۔

۴۔ اگر دو روایتوں میں سے ایک کے راوی متفق علیہ ہیں اور دوسری کے مختلف فیہ تو اس روایت کو ترجیح دی جائے گی جس کے راوی متفق علیہ ہیں۔

۵۔ اس امر کو بھی ملحوظ رکھا جائے گا کہ کس راوی نے اپنے شیخ سے پختگی عمر میں روایت لی ہے اور کس نے کم سنی میں۔ پختگی عمر میں روایت لینے والے کی روایت کو ترجیح دی جائے گی۔

۶۔ اگر ایسی دو روایتیں ہوں جن میں سے ایک پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں عمل ہوتا رہا ہو اور دوسری روایت ایسی ہو جس پر ان کے دورِ خلافت میں عمل نہ ہوا ہو تو پہلی روایت کو ترجیح دی جائے گی اور اسی پر عمل کیا جائے گا۔

۷۔ جس طرح کتاب اللہ کے بارے میں امام شافعیؒ کا اصول یہ ہے کہ ظاہری معنی کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مفہوم اختیار کرنے کی جب تک کوئی مضبوط دلیل نہ ہو، اس وقت تک ظاہری

معنی مراد لیے جائیں گے۔ حدیث کے بارے میں بھی وہ یہی کہتے ہیں کہ حدیث ہمیشہ اپنے ظاہری معنی پر محمول کی جائے گی۔ اگر اس میں ایک سے زائد معانی کا احتمال ہے تو پھر وہ معنی مراد لیے جائیں گے جو عرب کے محاورے کے مطابق ہوں گے۔

۸۔ حنفی اور مالکی فقہاء حدیث مرسل اور حدیث منقطع سے استناد کرتے تھے۔ امام شافعیؒ نے یہ اصول وضع کیا کہ ایسی احادیث پر بعض مخصوص شرائط کے ساتھ عمل کیا جائے گا، مطلقاً ان سے استدلال نہیں کیا جائے گا۔

۹۔ حدیث مرسل (۱) کو قبول کرنے کے بارے میں امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ وہ صرف ان کبار تابعین کی مراسیل قبول کرتے ہیں جنہوں نے بہت سے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کسبِ فیض کیا ہو یا اس مرسل حدیث سے ملتی جلتی حدیث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سند کے ساتھ مامون حفاظ حدیث نے روایت کی ہو، یا اس کی تائید کسی دوسری مرسل حدیث سے ہوتی ہو جسے اہلِ علم نے دوسری سند کے ساتھ قبول کیا ہو، یا کسی صحابی کا قول اس مرسل حدیث سے موافقت رکھتا ہو، یا اگر اہل علم کی کچھ جماعتیں کسی مرسل کے مطابق فتویٰ دیتی ہوں تو اس مرسل کو تسلیم کیا جائے گا اور یہ قبول مرسل کا آخری درجہ ہوگا (۲)۔

۱۰۔ ان کی رائے ہے کہ اگر اقوالِ صحابہؓ کسی حدیث کے خلاف ہوں تو حدیث پر عمل کیا جائے گا اور اقوال صحابہؓ کو رد کر دیا جائے گا۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اقوالِ صحابہؓ کا مرتبہ کتاب وسنت اور اجماع کے بعد لیکن قیاس پر مقدم ہے۔ اختلاف کی صورت میں خلفائے راشدین میں سے کسی ایک کے قول کو مقدم رکھا جائے گا۔ اس کے علاوہ صورت میں اس صحابی کا قول اختیار کیا جائے گا جس کا قول کتاب وسنت سے زیادہ قریب ہو۔ اگر کسی صحابی کے قول کے خلاف دوسرے صحابی کا کوئی قول نقل نہ ہو تو اسے مانا جائے گا (۳)۔

۱۔ حدیث مرسل وہ حدیث ہے جس کی سند تابعی پر ختم ہو جائے اور اس صحابی کا ذکر نہ ہو جس سے وہ تابعی روایت کر رہا ہے۔
۲۔ الامام الشافعی ص ۳۷۷
۳۔ حوالہ بالا ص ۴۵۰ وما بعد

Marfat.com

۱۱۔ فقہاء کے درمیان یہ معاملہ مختلف فیہ رہا ہے کہ کیا کوئی حدیث صحیح، قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کرسکتی ہے یا نہیں۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ کوئی بھی حدیث قرآن کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کرسکتی۔

امام شافعیؒ خبرِ واحد سے استدلال میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتے مگر شرط یہ لگاتے ہیں کہ اس کا راوی ثقہ اور معتمد ہو، حفظ اور صدق میں اچھی شہرت رکھتا ہو، ناقدین حدیث نے اسے کبھی کذب اور تدلیس سے متہم نہ کیا ہو اور سند بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو۔ راوی جو حدیث بیان کر رہا ہے اس کا مفہوم وہ اچھی طرح سمجھ رہا ہو، راوی جس راوی سے حدیث کی روایت کر رہا ہے اس سے خود اس نے براہ راست سماعت کی ہو اور اہل علم کی حدیث سے یہ حدیث مخالف نہ ہو۔

خبر واحد میں اگر یہ تمام شرائط پائی جاتی ہوں تو پھر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ کوئی حدیث مشہور مضمون اور معنی کے اعتبار سے اس کی مؤید ہے یا نہیں [1]، جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ خبر واحد کی قبولیت میں اس قسم کی شرطیں لگاتے ہیں۔ خبر واحد کے قبول کرنے میں امام شافعیؒ، امام مالکؒ کی طرح یہ شرط بھی نہیں لگاتے کہ اہلِ مدینہ کا عمل اس کے مطابق ہو [2]۔

حدیث کے بارے میں امام شافعیؒ کا یہ طرزِ عمل منصفانہ اور عقلی ہے کہ صحیح اور متصل روایت خواہ وہ مدینہ کی ہو یا کوفہ کی، یا کسی اور علاقے کے راویوں سے پہنچی ہو، اگر اس کی سند قوی اور قابلِ اعتماد ہے تو اسے قبول کیا جائے گا۔

۳۔ اجماع

کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امام شافعیؒ اجماع سے استدلال کرتے ہیں اور اسے احکام وقوانین کا مصدر مانتے ہیں۔ لیکن اجماع کو امام مالکؒ کی طرح مقید ومشروط کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اجماع معتبر ہے جو عہد رسالت کے بعد ایک عصر کے تمام فقہاء اور مجتہدین کا کسی حکم شرعی کے بارے میں ہو۔ اس کے ساتھ مزید یہ قید لگاتے ہیں کہ فقہائے عصر میں سے کسی کے

۱۔ الامام الشافعی ص ۳۷۵

۲۔ توالی التاسیس ص ۵۳ ومابعد

Marfat.com

اختلاف کا ہمیں علم نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی حکم پر جمہور فقہاء کا اتفاق ہو تو وہ ان کے نزدیک اجماع نہیں کہلائے گا۔ اسی طرح اگر کسی ایک علاقے کے فقہاء اور مجتہدین کا کسی حکم شرعی پر اتفاق ہو تو وہ بھی امام شافعیؒ کے نزدیک اجماع کے زمرے میں نہیں آئے گا۔

اجماع کے بارے میں امام شافعیؒ کے اس نظریئے سے یہ نتیجہ نکلا کہ انہوں نے اجتہادی مسائل میں اجماع کے اصول کو تسلیم کیا مگر اس کی جو تعریف کی، اس کے لیے جو شرائط مقرر کیں اور جو پیمانہ وضع کیا، اس کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ کسی زمانے میں اس قسم کا اجماع منعقد ہو سکتا ہے۔

اجماع کے دائرے کو امام شافعیؒ نے ایک اور طریقے سے تنگ کیا۔ وہ اس طرح کہ انہوں نے اجماع کی ایک قسم اور صورت کو جسے فقہاء نے اجماعِ سکوتی سے تعبیر کیا، رد کر دیا۔ اجماعِ سکوتی یہ ہے کہ مجتہدین میں سے کوئی مجتہد اپنے اجتہاد کی مدد سے کسی ایک نتیجہ پر پہنچے اور کوئی ایک رائے قائم کرے، وہ رائے اس کے اپنے دور میں معروف ہو، دوسرے فقہاء اور مجتہدین اس سے آگاہ ہوں لیکن اس کی مخالفت نہ کریں۔ امام ابوحنیفہؒ اجماع کی اس قسم کو بھی حجت مانتے ہیں اور ان کے نزدیک یہ شرعی احکام کے مصادر میں سے ایک مصدر ہے[1]۔

اجماع کے بارے میں امام شافعیؒ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ مناظرے کے وقت اگر اجماع سے ان کے خلاف کوئی دلیل پیش کی جائے تو ان مسائل میں وہ اجماع کا انکار کرتے ہیں۔ مناظرہ کرنے والا جب ان سے پوچھتا ہے کہ یہ بتایئے کہ اجماع کا کوئی وجود ہے بھی یا نہیں؟ تو پھر وہ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ بے شک فرائض کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے جس کے بارے میں کوئی شخص ناواقفیت کا انکار نہیں کر سکتا۔ پس یہ ایسا اجماع ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ تمام لوگوں نے ان مسائل پر اتفاق کر لیا ہے اور کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نہیں یہ اجماع نہیں ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی طریقہ جس سے اجماع کی صداقت پرکھی جا سکتی ہے۔

۱۔ الرسالۃ ص ۶۹

Marfat.com

امام شافعیؒ نے اپنی کتاب اختلاف الحدیث میں وضاحت کی ہے کہ صحابہ اور تابعین نے جن امور پر اجماع کیا تھا وہ اصول فرائض اور واجبات سے تعلق رکھتے ہیں۔

امام شافعیؒ صحابہؓ کے اجماع کو خبر واحد کے مقابلے میں حجت مانتے اور اسے ترجیح دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کا اجماع، خبر واحد سے بالاتر ہے۔ البتہ اجماع صحابہؓ نہ ہونے کی صورت میں خبرِ واحد پر عمل کیا جائے گا، بشرطیکہ صحیح سند سے ثابت ہو۔

۴۔ قیاس

کتاب اللہ، سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع سے بھی جب کسی مسئلے میں کوئی رہ نمائی نہیں ملتی تو پھر امام شافعیؒ قیاس سے کام لیتے ہیں۔

امام شافعیؒ سے پہلے فقہاء نے ایسے مسائل اور حوادث کا حکم معلوم کرنے کے لیے قیاس سے کام لیا ہے جہاں کتاب اللہ، سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع نے کسی حکم کی نشاندہی نہیں کی۔ امام شافعیؒ سے پہلے بنیادی اور اصولی ضابطوں کے علاوہ دوسرے ذیلی اور تفصیلی قواعد وضوابط نہ تھے۔ انہوں نے وہ وضع کیے، قیاس کے حدود کا تعین کیا اور بتایا کہ قیاس کا عمل کس حد تک جائز ہے اور کس حد کے بعد اس کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس کے مراتب کا تعین کیا اور یہ بھی بتایا کہ کیا ہر فقیہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ پیش آمدہ مسائل کا حکم معلوم کرنے کے لیے قیاس کر سکتا ہے یا اس کی کچھ شرائط اور قیود ہیں۔

شرعی مسائل کا حکم معلوم کرنے کے لیے کتاب اللہ، سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع، خواہ وہ اجماع صحابہؓ ہو یا اجماع فقہاء، ایک محفوظ اور بے خطر طریق کار تھا۔ ان کے مقابلے میں قیاس ایک نازک اور پُر خطر طریق کار تھا۔ امام شافعیؒ نے اس کی اہمیت اور نزاکت کو محسوس کیا۔ ان کے فکر ونظر نے یہ رسائی کی کہ اس عقلی طریق کار کو اگر بے قید چھوڑا گیا تو آنے والے ادوار میں غیر مخلص لوگ اسے غلط استعمال کر سکتے ہیں۔ انہوں نے تفصیلی قواعد اور ضوابط مرتب کر کے اس کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ ادلہ شرعیہ کے بارے میں انہوں نے جو قواعد وضوابط مقرر کیے، بعد میں

Marfat.com

آنے والے فقہاء نے انہیں تسلیم کیا اور پیش آمدہ مسائل کا حکم معلوم کرتے وقت انہیں ملحوظ رکھا۔

امام شافعیؒ "مصلحتِ مرسلہ کو بھی صرف اس صورت میں تسلیم کرتے ہیں جب وہ اس مصلحت معتبرہ کے مشابہ ہو جو نص سے یا اجماع سے ثابت ہو۔ امام شافعیؒ "عملِ اہلِ مدینہ کی حجیت کے بھی قائل نہیں ہیں [۱]۔

شافعی مسلک کی ترویج واشاعت

شافعی مسلک کی ابتداء عراق سے ہوئی، کیونکہ مدینہ اور امام مالکؒ کو چھوڑنے کے بعد امام شافعیؒ نے عراق میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ اس وقت بلادِ اسلامیہ کی صورت حال یہ تھی کہ لوگ کسی ایک امام کی تقلید میں منحصر نہیں ہوئے تھے۔ حجاز اور عراق بطور خاص فقہاء کے مراکز تھے۔ لوگوں کی جس فقیہ اور مجتہد تک رسائی ہوتی یا جو جس سے قریب ہوتا، بلکہ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس کا جس پر دل مطمئن ہوتا وہ اس سے مسئلہ پوچھ لیتا اور فتویٰ لے لیتا۔ کسی خاص امام کی پیروی ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی اور لوگ فقہی مسالک کو دین کا درجہ نہیں دیتے تھے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ امام شافعیؒ کے فقہی مسلک کی بنیاد عراق میں پڑی، یہیں اس کی ابتدائی نشوونما ہوئی اور یہیں سے اس کے تعارف کا آغاز ہوا۔ آپ نے زندگی کے آخری پانچ سال مصر میں گزارے [۲]۔

عراق میں علمِ فقہ امام ابوحنیفہؒ کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ متعارف ہو چکا تھا بلکہ اپنے قدم جما چکا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے نامور تلامذہ نے بھی عراق ہی کو اپنی علمی کاوشوں کا مرکز بنایا اس لیے کوئی دوسرا فقہی مسلک وہاں زیادہ پھل پھول نہ سکا۔ پھر بھی امام شافعیؒ جب عراق کو خیرباد کہہ کر مصر گئے تو آپ نے اپنے پیچھے عراق میں امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ)، امام داؤد ظاہریؒ (م ۲۷۰ھ)، امام ابوثور بغدادیؒ (م ۲۴۰ھ) اور امام ابن جریر طبریؒ (م ۳۱۰ھ) جیسے باصلاحیت تلامذہ چھوڑے۔ ان حضرات نے عراق میں فقہ شافعی کو متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اگرچہ امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابن جریر طبریؒ نے بعد میں اپنے الگ فقہی مسلک کی بنیاد ڈالی [۳]۔

۱۔ مناهج الاجتهاد ص ٦٦٦
۲۔ الانتقاء ص ٦٨
۳۔ الامام الشافعی ص ۳۷۱

Marfat.com

ایک دور ایسا بھی آیا کہ عراق اور مصر کے علاوہ خراسان اور ماوراء النہر میں بھی شافعی مسلک پھیل گیا۔ فتاویٰ اور درس وتدریس میں شوافع نے احناف کی ہم سری اور برابری اختیار کر لی۔ دونوں مسالک کے علماء میں مناظروں اور علمی مباحث کی مجلسیں خوب گرم ہونے لگیں اور ہر ایک مسلک کے علماء نے اختلافی مسائل پر اپنے دلائل سے کتابوں کو بھر ڈالا۔ لیکن مشرق پر تباہی اور بربادی کی آندھی چلی تو وہاں کی ساری علمی رونقیں قصۂ پارینہ بن گئیں۔ اس انقلاب نے وہاں سے شافعی مسلک کو بالکل ختم کر دیا۔

مصر میں شافعی مسلک کو تیسری صدی ہجری ہی سے فروغ حاصل ہوا لیکن جب وہاں دولتِ فاطمیہ قائم ہوگئی تو حکومتی سطح پر اہل سنت کے فقہی مسالک کو ختم کر دیا گیا۔ اس وقت وہاں فقہِ مالک اور فقہ شافعی زیادہ مقبول تھا۔ فقہِ حنفی کے علماء بھی موجود تھے اور وہ بھی اہلِ مصر کے لیے غیر معروف نہ تھا۔ دولتِ فاطمیہ میں فقہِ اہلِ تشیع کو رائج کیا گیا، حتیٰ کہ صلاح الدین یوسف بن ایوب کے ہاتھوں دولتِ فاطمیہ کا خاتمہ ہوا۔ اس وقت شافعی مسلک پہلے سے زیادہ توانائی کے ساتھ ابھرا۔ امام ابو حامد محمد غزالیؒ (م ۵۰۵ھ)، علامہ تقی الدین بن دقیق العیدؒ (م ۷۰۲ھ) اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) جیسے اہلِ علم وفضل نے مصر میں شافعی مسلک کو قوت بخشی۔

دولتِ ایوبیین کے پورے عرصے میں عدالتی نظام شافعی مسلک کے مطابق رہا۔ مصر میں شافعی مسلک آج تک مالکی مسلک کے شانہ بشانہ ہے۔ بالائی مصر میں مالکی مسلک کا غلبہ ہے اور زیریں مصر میں شافعی مسلک کا[1]۔

ملک شام میں ابتداءً (تیسری صدی ہجری میں) امام اوزاعیؒ (م ۱۵۷ھ) کا فقہی مسلک پھیلا لیکن اس کا اثر ونفوذ بہت کم عرصہ قائم ہوا۔ دمشق کے مفتی ابوالحسن احمد بن سلیمانؒ کی وفات کے ساتھ ہی شام میں اوزاعی مسلک ختم ہوگیا۔ یہ ۳۴۷ ہجری کا واقعہ ہے۔ یہ اوزاعی مسلک کے شام میں آخری مفتی اور فقیہ ثابت ہوئے۔ شام میں اوزاعی مسلک کی جگہ شافعی مسلک نے لے لی۔ اس طرح

۱۔ الامام الشافعی ص ۳۷۷

Marfat.com

مصر میں شافعی مسلک، مالکی مسلک کے شانہ بشانہ قائم ہو گیا۔ شام میں اس نے حنفی مسلک کے بعد اپنے لیے جگہ بنالی۔ شام میں محی الدین نوویؒ (م ۶۷۶ھ) اور عزّ الدین بن عبد السلامؒ (م ۶۶۰ھ) نے نہ صرف اپنی قابلیت و شہرت کا سکہ جمایا بلکہ شافعی مسلک کی بھی قابلِ قدر خدمت کی۔

حجاز، شام، عراق اور مصر کے علاوہ شافعی مسلک کا اثر و رسوخ یمن میں بھی ہوا۔ فارس میں بھی اس کا تعارف ہوا اور اس نے وہاں اپنے پیروکاروں کا ایک حلقہ بنایا لیکن جب حکومت اہلِ تشیع کے ہاتھوں میں آ گئی تو وہاں سے اہلِ سنت کے تمام فقہی مسالک ختم ہو گئے اور صرف دو فقہی مسلک باقی رہ گئے، فقہِ اہل تشیع اور فقہ حنفی۔ آج تک ایران میں یہی صورت حال ہے۔

بلادِ مغرب اور اندلس میں شافعی مسلک کبھی داخل نہ ہو سکا۔ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اس علاقے میں کوئی بھی فقہی مسلک، فقہِ مالک کی برتری کو ختم نہیں کر سکا۔ علامہ مقدسیؒ کے بقول مالکی علماء کو امام شافعیؒ پر یہ غصہ تھا کہ انہوں نے حدیث اور فقہ دونوں امام مالکؒ سے حاصل کیے، جب خود کچھ ہو گئے تو امام مالکؒ سے اختلاف کیا اور اپنا الگ مسلک قائم کر لیا[1]۔

جنوبی ایشیا میں فقہِ شافعی کا اثر و رسوخ صرف ملایا میں ہو سکا۔ ہندوستان کے جنوبی علاقوں میں بھی شافعی مسلک کے پیروکاروں کی بہت معمولی تعداد ہے۔

[ڈاکٹر محمد میاں صدیقی]

مصادر و مراجع

۱۔ ابن حجر عسقلانی، احمد بن علی (م ۸۵۶ھ)، **توالی التاسیس**، المطبعة الأميرية ببولاق مصر ۱۳۰۱ھ

۲۔ ابن خلکان، احمد بن محمد بن ابراہیم (م ۶۸۱ھ)، **وفیات الاعیان**، طبع مصر ۱۳۱۰ھ

۳۔ ابن عبد البر، ابو عمر یوسف بن عبد اللہ (م ۴۶۳ھ)، **الانتقاء فی فضائل الائمة الفقهاء**، مكتبة قدسی مصر

۱۔ حوالہ بالا ص ۳۷۳، نیز دیکھیے: مقدمہ ابن خلدون باب ۶، فصل ۷

Marfat.com

۴۔ ابوزہرہ، **الامام الشافعی**، دارالفکر العربی

۵۔ خطیب بغدادی، ابوبکر احمد بن علی (م ۴۶۳ھ)، **تاریخ بغداد**، دارالکتاب العربی، بیروت

۶۔ شافعی، امام محمد بن ادریس (م ۲۰۴ھ)، الرسالة، مصر

۷۔ شافعی، امام، **کتاب الام**، بیروت

۸۔ فخرالدین رازی محمد بن عمر (م ۶۰۶ھ)، **مناقب شافعی**، طبع مصر ۱۲۷۰ھ

۹۔ محمد سلام مدکور، **مناهج الاجتهاد**، دارالنهضة مصر ۱۹۶۰ء

۱۰۔ یوسف موسیٰ، ڈاکٹر، **الفقه الاسلامی**، طبع مصر ۱۹۵۸ء

Marfat.com